فانوس ڈائجسٹ

کلکتہ

سیّدنا نمبر





In Memorium

We dedicate this little effort of ours to the holy memory of Syedna Dr. Tahir Saifuddin Saheb (Late), the 51st Dai-El-Mutlaque of Dawoodi Bohra Community & Chancellor, Aligarh Muslim University who in his life did so much for the sake of Betterment & Prosperity of human beings & for India Itself.

Chief Editor.

SAIFEE MAHAL, PAWAI ROAD,
MALABAR HILL,
BOMBAY-6

August 2, 1966

MESSAGE

I send you my good wishes on the occasion of the publication of a special number of the 'Fanoos Digest'.



VP(4) 1256/66

उपराष्ट्रपति, भारत
नई देहली
VICE-PRESIDENT
INDIA
NEW DELHI

مورخہ ۲۰ جولائی سنہ ٦٦

مکرم بندہ ــــ السلام علیکم

نوازش نامہ ملا - یاد فرمائی کا شکریہ -

یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ ماہنامہ " فانوس ڈائجسٹ " کو جو ناموافق حالات کے سبب فوٹو آفسٹ پر شایع ہونا بند ہو گیا تھا۔ آپ دوبارہ پھر فوٹو آفسٹ پر شایع کرنے والے ہیں - خدا آپ کی کوششوں کو کامیاب فرمائے - میری نیک خواہشات اور دعائیں آپ کے ساتھ ہیں -

والسلام

مخلص

(ذاکر حسین)

جناب عطاالرحمن شاد صاحب

ایڈیٹر " فانوس ڈائجسٹ " (اردو)
۱۵ - ڈی - حاجی محمد محسن اسکوائر
کلکتہ ــ ١٦

प्रधान मंत्री सचिवालय
PRIME MINISTER'S SECRETARIAT

नई दिल्ली-११,
New Delhi-11, the

Dear Sir,

The Prime Minister thanks you for your letter of July 20 and sends her good wishes for the success of the special number of your journal which you are bringing out in honour of His Holiness Syedna Mohammed Burhanuddin Saheb, the Head of the Dawoodi Bohra Community.

Yours faithfully,

(H.Y. SHARADA PRASAD)
Information Adviser
to the Prime Minister

SHRI ATAUR RAHMAN SHAD
Chief Editor
Monthly Fanoos Digest,
CALCUTTA-16.

RAJ BHAVAN
BOMBAY
July 25, 1966.

I am glad to hear that the Management of Fanoos Digest is bringing out a SAYEDNA NUMBER in August this year. I wish the Number every success.

ستمبر ۱۹۶۶

سیّد نا نمبر

فانوس ڈائجسٹ کلکتہ

مجلس ادارت

عطاء الرحمن شاد (صدر مجلس)

فیروز سلطان اعجاز

مدیران خصوصی

غلام محمد اختر

مشتاق اعظمی

خلیل احمد خالد

نگراں: رضوان اللہ فاروقی

زر سالانہ: ۱۵ روپے

ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ فانوس ڈائجسٹ

کلکتہ ۱۶

جلد نمبر ۲ قیمت: ڈیڑھ روپے شمارہ ۱۲



اس شمارے میں

فانوسِ خیال

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔ مگر زمانے کی شکست و ریخت نے اسے بے شمار فرقوں میں منقسم کر دیا ہے۔ ان میں سے ایک داؤدی بوہرہ فرقہ بھی ہے جس نے تمام شعبہ ہائے زندگی میں بے پناہ ترقیاں کی ہیں جس کا ماضی شاندار، حال روشن اور مستقبل درخشاں ہے۔ سیدنا نمبر اسی فرقے سے روشناس کرانے کی ایک معمولی کوشش ہے۔ حقیقتاً قوم بواہر سے متعلق جتنے معیاری اور معلوماتی مضامین اب تک اردو زبان میں شائع نہیں ہوئے۔ سیدنا سے متعلق نصف درجن نایاب نسخے ہیں۔ بعض مخطوطات کتابیں اور دستاویزات تو تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ دوران طباعت فوٹو آفسیٹ مشین میں خرابی کے باعث چند صفحات کی طباعت لیتھو پر کرانی پڑی تاکہ وقت پر پرچہ آپ تک پہنچ سکے۔

الداعي الفاطمي

الثاني والخمسون

١٣٨٥

تاج الدعوة الطيبية الغر قرة عين امام المتقين حجة العلماء الموحدين منصور اليمن

الدكتور سيدنا ابو القائد جوهر

محمد برهان الدين

وطول الٰهي عمر برهان ديننا ... مدى حار من غر الشهور افانينا

وحاء كاشاء الاله وصاحب ... مرام سليل المصطفى وكا شئنا

ممجد المحمود في الخلق كله ... وذكرا حسنة عن وصفها قد يعينا

مستوي على عرش النيابة الامامية

١٣٨٥

ماہ ذی قعدہ ۱۳۸۵ھ میں داؤدی بوہرہ فرقے کے ... نے تقدس مآب سیدنا ڈاکٹر محمد برہان الدین کی تخت نشینی کے موقع پر ایک یادگار اور شاندار جشن منایا۔ اس تاریخی موقع پر ایک خوبصورت طغریٰ تیار کیا گیا۔ ... اس کی تصویر ہے۔

قوم بوہرہ کے رسم و رواج

خاتون علی زنجیباری

تہذیب و جمیلہ

س جہانِ رنگ و بو میں اولادِ آدم مختلف نسلوں موں، فرقوں اور برادریوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ہر قوم و نسل ے رسم و رواج الگ الگ اور عجیب و غریب ہیں۔

اس مضمون میں داؤدی بوہرہ جماعت کے رسم رواج کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس فرقے کے لوگ تجارت کے اعتبار سے اپنی محدود تعداد کے باوجود دنیا ہر میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ مذکورہ فرقے کے آبا و اجداد جرات کے قدیم باشندے تھے۔

مصر کے فاطمی خلیفہ مستنصر کے عہد خلافت میں یمن کے تین مسلمان مبلغ احمد، عبداللہ اور نور محمد (نور الدین) ۴۵۰ ہجری میں گجرات کی مشہور بندرگاہ کھمبات میں وارد ہوئے۔ اُن تینوں مبلغوں میں عبداللہ نے تبلیغ اسلام میں کافی شہرت و کامیابی حاصل کی اور اپنی کراموں کی بدولت مقامی لوگوں کے قلوب مسخر کر لئے۔ اُن کی پہلی کرامت کا ظہور اس طرح ہوا کہ ایک ہندو کسان کا کنواں جو عرصے سے خشک چلا آ رہا تھا اُن کی دعا سے پانی سے لبریز ہو گیا اس کرامت سے متاثر ہو کر کسان مع اپنی بیوی کے مشرف بہ اسلام ہو گیا۔

دوسری کرامت یہ بیان کی جاتی ہے کہ کھمبات کے ایک صنم خانے میں لوہے کا ایک ہاتھی بغیر کسی سہارے کے ہوا میں معلق تھا۔ عبداللہ نے اسے زمین پر گرا دیا۔ یہ دیکھ کر صنم خانے کے سارے معتقدین داخلِ اسلام ہو گئے۔ اس واقعہ کو راویوں نے اس طرح بھی بیان کیا ہے کہ اس صنم خانے کی دیواریں مقناطیسی تھیں جن کی

وجہ سے وہ مصنوعی "آہنی فیل" معلق رہتا تھا اور مقناطیسی
کشش اُس ہاتھی کا توازن قائم کئے رہتی تھی۔ حضرت
عبداللہ نے دیوار کا ایک خفیف سا حصہ توڑ دیا جس کی
وجہ سے کشش کا توازن برقرار نہ رہ سکا اور نتیجہ میں
"آہنی فیل" نیچے آ رہا۔

کھمبات میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد حضرت
عبداللہ پٹن چلے گئے جو اس زمانے میں گجرات کا دارالحکومت
تھا۔ یہاں ان کی تعلیم و تبلیغ سے جب غیر مسلموں میں
اسلام کا چرچا شروع ہوا تو راجہ سدھ راج جے سنگھ
نہار مل کو بڑی تشویش ہوئی۔ اس نے اپنی فوج کا ایک
مسلح دستہ حضرت عبداللہ کو گرفتار کرنے کے لئے
بھیجا۔ حضرت عبداللہ نے خدائے واحد سے فتح و نصرت
کی دعا کی۔ چنانچہ آگ کی چار دیواری نے انھیں اپنے
گھیرے میں لے لیا۔ راجہ کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی
تو وہ خود پہونچا اور آگ کی چار دیواری کو دیکھ کر ششدر
رہ گیا۔ اس نے جناب عبداللہ کے پاس حاضر ہونے کی
استدعا کی۔ حضرت عبداللہ کی کرامت سے آگ کی چار دیواری
میں ایک دروازہ ظاہر ہوا جس میں سے گزر کر راجہ اُن
تک پہونچا۔ اب راجہ نے ایک اور کرامت دیکھنے کی
خواہش ظاہر کی۔ حضرت عبداللہ کے اشارے سے
صنم خانے کے ایک بت نے اسلام کی حقانیت کی
گواہی دی۔ یہ دیکھ کر راجہ اور اس کے ساتھی مشرف
بہ اسلام ہوئے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت عبداللہ جب
پٹن پہونچے تو دیکھا کہ وہاں کے لوگوں میں اسلام
تبلیغ کرنا دشوار ہے۔ شہر کے تمام لوگ ایک ہندو
کے عقیدت مند تھے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ نے ا
زبان سیکھی اور آہستہ آہستہ اُن میں گھل مل گئے۔ ا
اُنھوں نے اس عالم کے ساتھ مباحثہ شروع کیا۔ ا
رفتہ عالم کے خیالات بدلنے لگے۔ آخر کار وہ اپنے
پیروؤں کے ساتھ حلقہ بگوش اسلام ہوا۔ ان لوگو
راجہ بھارمل کا وزیر بھی تھا جس نے بعد میں وہاں کے
کو بھی قبولیت اسلام کی دعوت دی جسے راجہ
قبول کر لیا۔

حضرت عبداللہ کے ساتھی حضرت نور محمد
(نور الدین) نے دکن میں اسلام کی شمع روشن کی۔
اورنگ آباد اور اس کے قرب و جوار میں نمایاں کا
ہوئی۔ ان کا مزار اورنگ آباد سے چالیس میل کے ف
پر ایک قریہ ڈونڈگاؤں میں موجود ہے اور مزار مو
صاحب کے نام سے مشہور ہے۔

اسی اثنا میں یمن سے ایک اور مبلغ فخرا
آئے۔ انھوں نے بھی سلسلہ تبلیغ دکن میں شروع
لیکن ایک سفر کے دوران بھیل نامی ایک قوم
انھیں شہید کر دیا۔ ان کا مزار موضع گلیا کوٹ میر

ان مبلغین اسلام کی کوششوں سے گ
اور دکن میں مسلمانوں کی تعداد روز بروز بڑھتے
یہی گجراتی مسلمان بوہرے کہلاتے ہیں۔ بوہرہ گجرا
ہے جس کے معنی ہیں تاجر۔ اور گجراتی ہونے کی منا

سے ان کی مادری زبان گجراتی ہے اور وہ تجارت پیشہ ہیں۔

بوہرے اس وقت ہندوستان، پاکستان کے علاوہ لنکا، تھائی لینڈ، انگلینڈ، سنگاپور، برما، اور افریقہ کے شہروں ممباسہ، زنجیبار اور دارالسلام میں بھی قیام پذیر ہیں۔

اس فرقہ کے مذہبی اور روحانی پیشوا اور ۵۲ ویں داعی المطلق سیدنا ڈاکٹر محمد برہان الدین صاحب ہیں آپ کے والد محترم بوہرہ جماعت کے ۵۱ ویں داعی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر تھے۔ سیدنا برہان الدین صاحب بڑے مخیر ہیں۔ آپ نے داؤدی بوہرہ فرقہ کی اقتصادی حالت کو بہتر سے بہتر بنانے میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس وقت آپ کا شمار عالم اسلام کے چند ممتاز لیڈروں میں ہوتا ہے آج کل آپ بمبئی میں رہائش پذیر ہیں۔

بوہروں کی اس مختصر سی تاریخ کے بعد ان کے رسم و رواج پر بھی روشنی ڈالنی ضروری ہے۔ یہ رسوم جاننے سے تعلق رکھتی ہیں۔ جب ان کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو چھ دن کے بعد اس کا نام رکھ دیا جاتا ہے۔ نام بچے کی پھوپھی رکھتی ہے۔ جس دن نام رکھا جائے اس دن اسے سفید لباس پہنایا جاتا ہے جس پر زعفران چھڑکا ہوتا ہے۔ سر پر ٹوپی ہوتی ہے۔ بچے کے سرہانے یا اونچی جگہ پر ایک طشت میں قرآن پاک میں سے سورہ مریم کھول کر اس میں انار کی شاخ کی قلم رکھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ طشت میں آٹے سے بنا ہوا ایک گھی کا چراغ روشن ہوتا ہے جو ساری رات جلتا رہتا ہے۔ ولادت کے فوراً بعد سب سے پہلے بچے کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی جاتی ہے۔ اور پھوپھی بچے کو کان میں اس کا نام بتاتی ہے۔

بچہ جب سن شعور کو پہونچتا ہے تو پہلے اس کی دینی تعلیم کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی اسے مروجہ علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ سن بلوغت کو پہونچنے کے بعد اسے پاکیزہ کپڑے پہنا کر مذہبی رہنما کے پاس لایا جاتا ہے مذہبی رہنما اسے اپنے سامنے بٹھا کر کچھ دعائیں پڑھتے ہیں اور بعد ازاں اس سے مذہب کا عہد و پیمان کراتے ہیں۔ اس دن سے وہ مرد بالغ کہا جاتا ہے۔ اس رسم کو میثاق کہتے ہیں۔

اس فرقہ کے مردوں کا لباس عموماً پاجامہ قمیص اور شیروانی ہے۔ سر پر نہایت خوبصورت زرد پھلی ٹوپی پہنتے ہیں۔ عورتیں لمبا لہنگا (جسے وہ اپنی زبان میں گھاگھرا کہتی ہیں) اور بلاؤز پہنتی ہیں۔ سر پر دوپٹہ اوڑھتی ہیں۔ دوپٹے پر سنہری اور زرد پھلی خوبصورت کرن ٹانکی جاتی ہے۔

یہ لوگ بڑے خوش اخلاق ہوتے ہیں اور اپنے سے بڑوں کی عزت کرتے ہیں۔ کسی کے گھر میں جب ان کا جانا ہوتا ہے تو یہ اپنے سے بڑے کا ہاتھ تھام کر اسے پہلے آنکھوں سے لگاتے ہیں اور پھر پیشانی سے لگا کر

بوسہ دیتے ہیں۔ یہ اُن کا سلام ہوتا ہے۔

اکثر و بیشتر عربی مہینوں کی پہلی تاریخ کو اپنے رشتہ داروں کے پاس مصافحت کے لئے جانے کا بھی رواج ہے۔ شب جمعرات اور ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو اور عید وغیرہ کے موقعوں پر "بخور" کی دھونی دی جاتی ہے بخور ایک خاص قسم کی خوشبو کا نام ہے جو چند قیمتی خوشبودار اشیاء سے تیار کی جاتی ہے اور منجمد ہوتی ہے۔ اس میں اگر کی لکڑی بھی شامل ہوتی ہے۔ یہ رواج عربوں کے زمانے سے آج تک چلا آرہا ہے۔

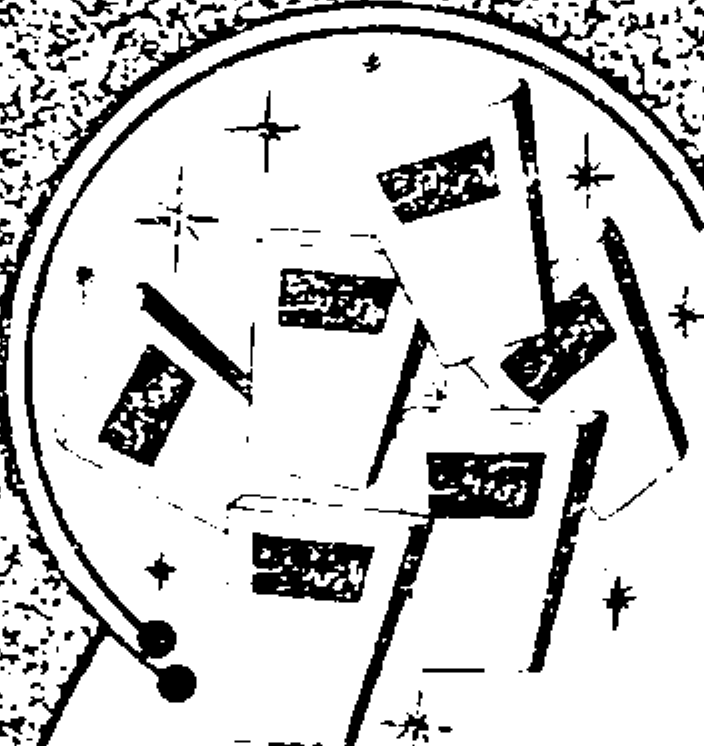
بوہرے اپنے گھروں کو بہت صاف ستھرا رکھتے ہیں، فرشی نشست انھیں زیادہ پسند ہے۔ ایک کمرے میں قالین یا دری اور اس پر سفید یا پھول دار چادر بچھائی جاتی ہے۔ دیواروں کے ساتھ بڑے بڑے گاؤ تکیے رکھے جاتے ہیں جن سے وہ ٹیک لگا کر بیٹھتے ہیں۔ کمرے میں جوتا پہن کر داخل نہیں ہوتے۔ کھانے کے وقت کمرے میں دسترخوان بچھایا جاتا ہے۔ اس پر ایک چوڑے پہیے کی شکل کی ایک آہنی چیز رکھی جاتی ہے جسے وہ اپنی زبان میں "کونڈلی" کہتے ہیں۔ اس پر ایک بہت بڑا طشت رکھا جاتا ہے۔ اس طشت میں کھانا ہوتا ہے جس میں گھر کے تمام افراد شریک طعام ہوتے ہیں۔ ان لوگوں میں الگ الگ پلیٹوں میں کھانا کھانے کا رواج نہیں ہے۔ مل کر کھانا باعث خیر و برکت سمجھتے ہیں۔ کھانا کھاتے وقت مردوں کے سر پر ٹوپی اور عورتوں کے سر پر دوپٹہ ہونا ضروری ہے۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے سب سے کم عمر شخص ایک چھوٹی سی پلیٹ میں سب کو نمک پیش کرتا ہے جسے چکھنے کے بعد بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کرتے ہیں، کھانا بڑے ادب سے کھاتے ہیں اور اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ روٹی کا کوئی ٹکڑا یا ریزہ اور چاول کا کوئی دانہ زمین پر گرنے نہ پائے۔ طشت میں کھانا چھوڑنا بھی ان کی نظروں میں مناسب نہیں ہوتا۔ کھانا ختم ہونے کے بعد نمک چکھایا جاتا ہے اور اس کے بعد دسترخوان اٹھا لیا جاتا ہے۔

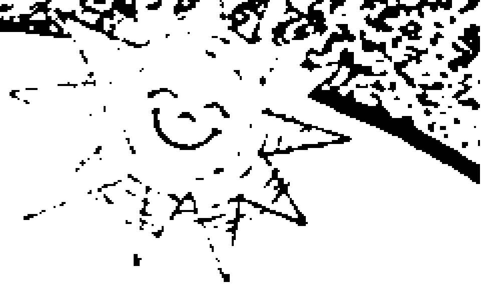
اگر دسترخوان پر مٹھائی موجود ہو تو کھانا پہلے میٹھی چیز ہی سے شروع ہوتا ہے۔ ان کے ہاں گوشت کو دودھ میں پکانے کا رواج ہے جسے وہ "خوردی" کہتے ہیں۔ خوردی کے ساتھ عموماً قیمہ کی کھچڑی کھائی جاتی ہے۔ بوہرے زندہ مچھلی خرید کر اس پر باقاعدہ کلمہ پڑھ کر ہاتھ پھیرتے ہیں اور پھر استعمال میں لاتے ہیں۔

بوہرے اپنی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں۔ وہ بچے جن کی رسم میثاق ادا نہیں ہوتی، اپنی علاحدہ صف قائم کرتے ہیں۔

ان کے ہاں شادی بھی بڑی سادگی سے ہوتی ہے اور مہر نکاح خوانی سے قبل قاضی کے روبرو ادا کیا جاتا ہے۔ کم سے کم ۱۴ روپے مہر ادا کیا جا سکتا ہے۔

> مشینی خرابیوں کے باعث ہمیں کچھ صفحات لیتھو پر طبع کرانا پڑے ہیں، ایسا اسلئے کرنا پڑا ہے کہ وقت پر آپ تک پرچہ پہونچ سکے۔ ناظم طباعت





اطمینان سے پڑھیے

اچھے رسائل بھی اچھی کتابوں کی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اسی باعث بیشتر اہلِ ادب اپنے ذاتی کتب خانہ میں ان کا باقاعدہ ریکارڈ رکھنے کی سعی کرتے ہیں اور اطمینان سے پڑھتے ہیں۔ کئی وجوہ کی بنا پر ان کا یہ شوق پورا نہیں ہو پاتا۔ کبھی کبھی یہ رسائل ضائع ہو جاتے ہیں نتیجتاً ریکارڈ نامکمل رہ جاتا ہے۔ اگر فانوس ڈائجسٹ کا ریکارڈ رکھنے کے سلسلے میں آپ کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہے تو .... کوئی مضائقہ نہیں

ہم نے آپ کے شوق کی تکمیل کا انتظام کر دیا ہے

پندرہ روپے بذریعہ منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر روانہ کر دیجئے اور ایک سال تک ماہانہ گھر بیٹھے حاصل کیجئے ...... یا پھر ذیل کا کوپن پُر کر کے ہمیں بھیج دیجئے۔ ہم آپ کو سالانہ وی پی سے روانہ کر دیں گے۔ اس طرح نہ تو ہر ماہ آپ کو ایجنٹ تک جانے کی زحمت ہوگی اور نہ ہی مایوسی کا شکار ہونا پڑے گا

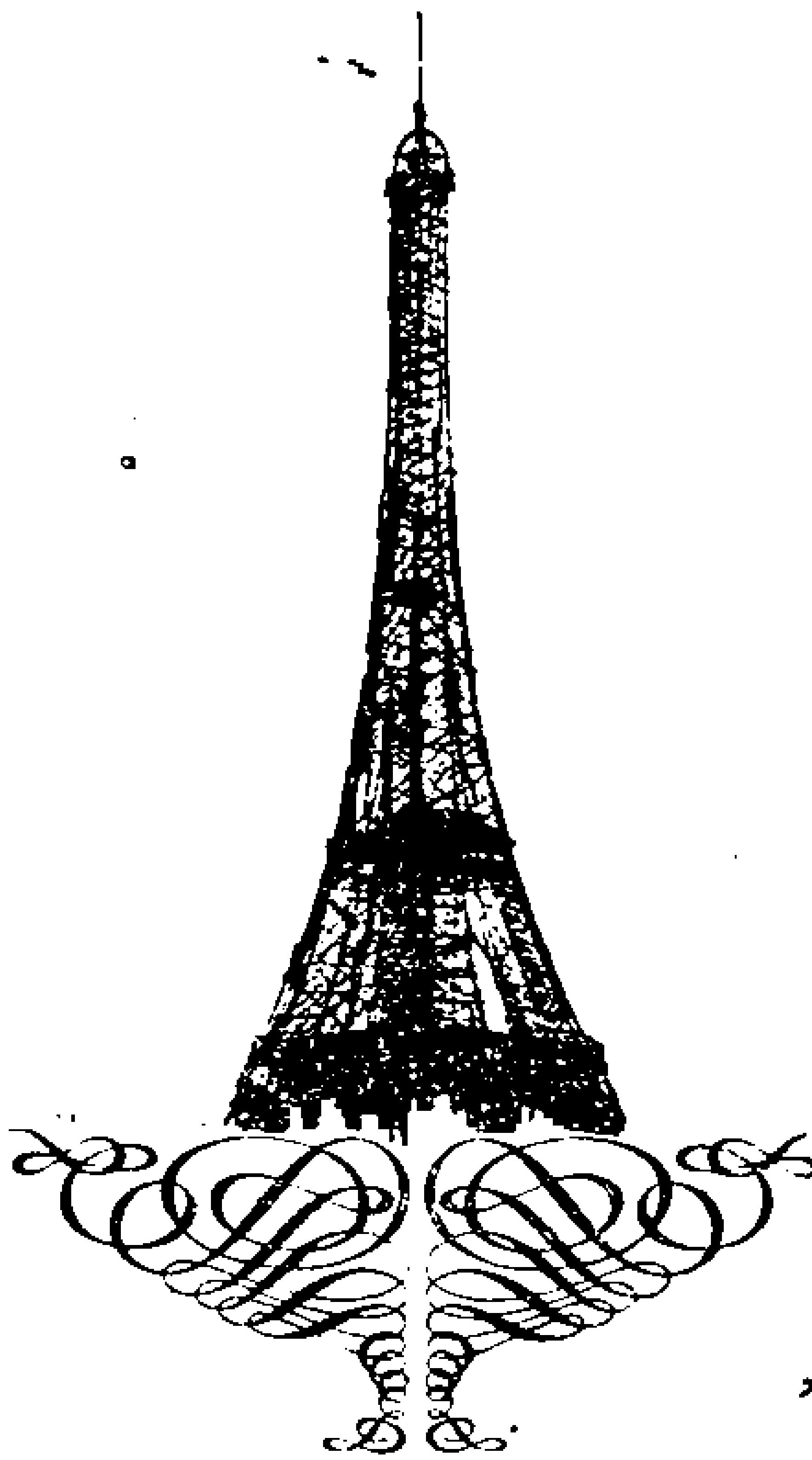
وی پی منگوانے کے لیے کوپن پر کر کے بھیج دیجئے۔

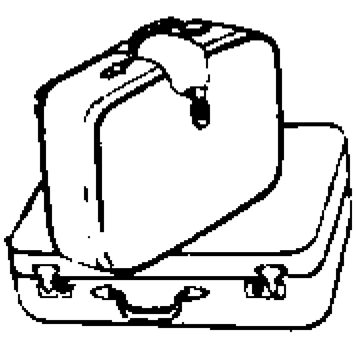


نام ....

پتہ ....

....





آفتابِ علم و ہدایت

غلام محمد اختر

دنیا میں معدودے چند مذہبی ہستیاں ہی ایسی ہیں جنھوں نے اخلاقی، سماجی، معاشی، تہذیبی اور سیاسی امور میں نہ صرف مہارت حاصل کی ہو بلکہ روحانی تقاضے بھی بہ حسن و خوبی پورے کئے ہوں۔ ان بزرگ ہستیوں میں داؤدی بوہرہ فرقے کے سربراہ سیدنا ڈاکٹر محمد برہان الدین صاحب کی ذات بھی شامل ہے جو ہندوستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں مشہور ہے۔ داعی مطلق ان لاکھوں بوہروں کی پیشوائی کرتے ہیں جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور جنہیں ہر جگہ باعزت مقام حاصل ہے۔

داؤدی بوہرہ فرقہ کے عقیدے کے مطابق داعی واحد نائب امام ہے۔ جو امام کی جانب سے جملہ حقوق و فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ یہ عقیدہ دراصل اس اعتقاد کی ایک کڑی ہے کہ امام ہمیشہ دنیا میں قائم و دائم رہتے ہیں۔ ان کی ہستی فنا سے مبرّا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ داعی مطلق کو امام کی نیابت حاصل ہوتے ہی امامت کے سارے اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں جو قطعی مکمل اور ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہوتے ہیں۔ بوہرہ فرقہ کا ہر فرد ان پر کامل یقین و اعتماد رکھتا ہے۔ اسی عقیدے کی بدولت

دنیا کے تمام بوہری افراد ایک اکائی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی اکائی ایک زبردست روحانی تنظیم و تحریک کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔

تقدس مآب سیدنا کے پاس روزانہ ہزاروں خطوط تار اور لوگ آتے ہیں۔ یہ سب اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ ان کے مسائل بحسن و خوبی حل کرتے ہیں۔ انھیں عمدہ مشورے دیتے ہیں۔ یہ مشورے شادی، تجارت، تعلیم، سیاست، سفر و سیاحت الغرض تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلق ہوتے ہیں۔ قابلِ ذکر چیز یہ ہے کہ ان کے مشورے اور ہدایتیں ہمیشہ کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

دہرا اعزاز

گذشتہ پچاس سالوں سے اب تک داعیٔ مطلق سیدنا ڈاکٹر طاہر سیف الدین صاحب مرحوم نے جس استقلال، تدبر اور روحانی فیض سے داؤدی بوہرہ فرقہ کی پیشوائی کی وہ اظہر من الشمس ہے۔ ایسے متبرک عہدہ کے لئے کسی ایسی ہی لائق و فائق ہستی کا انتخاب ناگزیر تھا۔ چنانچہ سیدی محمد بھائی صاحب برہان الدین کا انتخاب ان کے والد محترم سیدنا مرحوم نے ۱۹۳۴ء میں ہی کر لیا تھا۔ آج وہی موجودہ اور ۵۲ ویں داعی مطلق ہیں۔ اور اپنے روحانی فیوض سے اپنے عقیدتمندوں کو سیراب کر رہے ہیں۔

انتخابی رسم

انتخاب کی رسم سورت کی سیفی مسجد میں زبردست جوش و خروش سے ادا کی گئی۔ اسی مسجد میں ۳۴ ویں داعیٔ مطلق سیدنا عبد علی سیف الدین صاحب وعظ فرمایا کرتے تھے مسجد کی فضاؤں میں گونجتے ہوئے اسلامی نعرے دورِ گذشتہ کی یاد تازہ کر رہے تھے۔ "داعیانِ دعوت" کے سیلِ بے پناہ نے انتخاب کی رسم میں حصہ لیا۔ اور داعی مطلق کے منتخب جانشین کی زندگی اور صحت اور بوہرہ فرقہ کی کامیابی کی دعائیں مانگی گئیں۔

متبرک زندگی

سیدنا برہان الدین صاحب ۶۔ مارچ ۱۹۱۵ء کو سورت میں پیدا ہوئے۔ پیدائش کے دوسرے ہی دن جشنِ نیابت منعقد ہوا۔ بوہرہ فرقہ کے سرکردہ اصحاب نے اس میں حصہ لیا اور یہ تقریب یادگار بن گئی۔ سیدنا برہان الدین صاحب کی تعلیم و تربیت کے لئے بہترین معلموں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ قلیل عرصہ میں ہی انھوں نے عربی کی تعلیم مکمل کر لی اور ۱۹ سال کی عمر میں آپ حافظِ قرآن ہو گئے۔ اب سیدنا مرحوم نے بذاتِ خود ان کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ انھوں نے بہت سے اسرار و رموز سے واقف کرایا اور فاطمی

سیدنا نمبر اور اس کے مضامین کے بارے میں آپ اپنی رائے سے ہمیں ضرور نوازیں —— مدیر

طرزِ زندگی اور عقاید کی عمدہ تعلیم دی۔ اماموں اور داعیوں کے خیالات اور اُن کی تعلیمات سے آگاہ کیا۔ سیدنا مرحوم کی ذاتی دلچسپی نے انھیں مختصر عرصے میں ہی ایک اچھا انسان بنا دیا۔ تعلیم و تربیت کی حُسنِ آراستگی نے انھیں اور بھی سنوار دیا۔

سیاحت

۱۹۳۰ء میں سیدنا مرحوم نے آپ کا میثاق لیا۔ اور آپ کو برہان الدین کے لقب سے ملقب کیا۔ تحریکِ دعوت کے ممتاز ترین ارکان ہی ایسے القاب سے سرفراز فرمائے جاتے ہیں۔ میثاق بوہروں کی زندگی کا نیا دور ہے۔ جبکہ وہ بالغ ہونے پر بوہرہ فرقہ سے اپنی وابستگی اور اسلام کے اصولوں پر چلنے کا عہد کرتے ہیں۔ اس کے بعد آپ نے مکہ، مدینہ، نجف اور کربلا جیسے مقامات مقدسہ کی زیارت کی۔ دو سال بعد آپ نے حدیث کا اعزاز حاصل کیا۔ ۱۹۳۲ء میں آپ کی شادی روایتی شان و شوکت سے سورت میں ہوئی۔

آپ نے سیدنا مرحوم کے ساتھ دنیا کے کئی ممالک کا دورہ کیا۔ بے شمار صدروں، بادشاہوں، وزیر اعظموں اور گورنروں سے ملاقات کی۔ سیفی محل میں شاہِ ایران اور شاہِ سعود کی ضیافت کے موقع پر سیدنا نے میزبانی کے فرائض سرانجام دیئے اور اپنے مہمانوں کو بہت متاثر کیا۔

اسلامی رابطے : تقدس مآب سیدنا نے دنیائے اسلام کے کئی دورے کئے تاکہ مسلمانوں کے اسلامی اور ثقافتی رابطے مزید مستحکم ہو جائیں۔ ان کے علاوہ مسلم ممالک کے افکار و مسائل سے بھرپور آگاہی حاصل کی۔ اس سلسلے میں مغربی ایشیائی ممالک خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ تحریکِ دعوت کے سلسلے میں موجودہ داعیٔ مطلق نے سیدنا مرحوم کو نہ صرف علمی سہارے دیئے بلکہ کلی تعاون کا شرف بھی حاصل کیا اور تحریکِ دعوت کو ہمیشہ قدم بہ قدم آگے بڑھاتے رہے تحریکِ دعوت سے ان کو گہرا شغف ہے۔ اسی والہانہ وابستگی کا نتیجہ ہے کہ وہ تمام مذہبی امور اور اپنے فرقہ سے متعلق سارے مسائل انتہائی آسانی سے حل کر لیتے ہیں۔ وہ روزانہ اوقاتِ مقررہ پر نماز ادا کرتے ہیں۔ سائلوں کو مطمئن کرتے ہیں۔ سیاسی و معاشی امور بڑی توجہ سے سلجھاتے ہیں۔ گویا عزت مآب سیدنا عالم باعمل ہیں اور اپنے فرقے کے لئے خصوصاً اور عالم اسلام کے لئے عموماً فیوضِ ربانی کے درخشاں آفتاب ہیں۔

علمی شغف

تقدس مآب سیدنا گہرا علمی شغف رکھتے ہیں سورت میں واقع عربی کالج بنام "جامعہ سیفیہ" ان کے دل کی دھڑکن ہے۔

آپ جامعہ سیفیہ کے امتحانات میں ذاتی دلچسپی لیتے ہیں۔ ہر سال جامعہ کے طلباء سے ملاقات کرتے ہیں

ان کے ساتھ مختلف موضوعات پر معلوماتی گفتگو فرماتے ہیں۔

سیدنا مرحوم کا جب علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے چانسلر کی حیثیت سے انتخاب ہوا تو تقدس مآب سیدنا کی تعلیمی سرگرمیوں کا دائرہ اور وسیع ہو گیا۔ وہ وقتاً فوقتاً یونی ورسٹی کا دورہ کرتے رہتے اور طلباء سے قریبی تعلقات قائم رکھتے۔ یہ انھیں کی دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ یونی ورسٹی کا نظام مثالی بن گیا۔

تہہ دار شخصیت

تقدس مآب سیدنا ڈاکٹر محمد برہان الدین صاحب اپنی فصاحت و بلاغت، زور بیان اور بلند تخیل کیلئے مشہور رہیں۔ آپ عمدہ مقرر ہیں۔ انتہائی زیرک و تیز شعور اور حساس طبیعت رکھتے ہیں۔ جب کبھی آپ کلاس لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ پیدائشی معلم ہیں۔ آپ حافظِ قرآن ہیں۔ اور جب کبھی تنہا ہوتے ہیں تو آیاتِ قرآنی کے اوراد انھیں روحانی لذت و سکون بخشتے ہیں۔

باعث صد فخر

تقدس مآب سیدنا برہان الدین صاحب ایک مذہبی پیشوا ہی نہیں، بلکہ انسانی زندگی کی دشوار اور پُر پیچ راہوں کے قابلِ اعتماد رہبر بھی ہیں۔

سیدنا نہایت خوش اخلاق ہیں۔ امیر و غریب، ضرورت مند و غیر ضرورت مند، سبھوں سے یکساں طور پر ملتے ہیں۔ آپ کے لہجے کی شیرینی دلوں میں گھلتی محسوس ہوتی ہے۔ آپ کی باتیں عقل و دانش کے اوراق ہیں آپ کے مشورے پُرخلوص اور صادق ہیں۔ آپ کی ذات ہر لحاظ سے بوہرہ فرقہ کے لئے باعث فخر ہے ——— یہی وہ ہستی ہیں جو ۵۲ ویں داعی المطلق اور سیدنا مرحوم کے لائق جانشین ہیں ●

اگلے ماہ سے

★ آپ کی تنقیدیں
★ آپ کے تبصرے
★ آپ کے مشورے
★ آپ کے مراسلات

شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے

تنقیدوں کو اہمیت دی جائے گی ——— مدیر



۵۱ ویں داعیِ مطلق تقدس مآب سیدنا ڈاکٹر طاہر
سیف الدین صاحب مرحوم جن کا عہد قوم بوہرہ کا
عہدِ زریں کہلاتا ہے۔


آپ کی آنکھیں اِس راز سے واقف ہیں
جی ہاں! وہ آپ کے چہرے کی دلکشی کے راز سے بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ فرحت بخشنے والی افغان اسنو سے پوری طرح مانوس ہیں۔ آپ کی آنکھیں آپ کے صحیح انتخاب کی معترف ہیں۔ آپ کی پسندیدہ معاونِ حسن
AFGHAN SNOW
افغان اِسنو
آپ کے چہرے میں حسین و خوش گوار تبدیلی لاتی ہے۔ ریشم کی طرح ملائم افغان اسنو آپ کے چہرے کے داغوں کو صاف اور بدنمائی کو دور کرتی ہے۔ جھریوں، مہاسوں اور پھنسیوں کی الجھنیں ختم ہوجاتی ہیں۔ افغان اسنو کا شکریہ! کہ اس کے روزمرہ استعمال سے آپ کا چہرہ صبح روشن کی طرح شگفتہ اور جاذب نظر رہتا ہے — افغان اسنو — آپ کا پسندیدہ معاونِ حسن
ای ایس پاٹن والا۔ بمبئی۔ ۷۷



تقدس مآب سیدنا برہان الدین صاحب ڈاکٹریٹ کا لباس پہنے ہوئے حاضرین کی تالیوں کا جواب دے رہے ہیں۔ سیدنا کو جامعہ الازہر قاہرہ کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی گئی۔ سامنے صحیفے پر اس اعزازی ڈگری کی تصویر دی جا رہی ہے جسے خود صدر جمال عبدالناصر نے سیدنا کو پیش کی۔

بسم الله الرحمن الرحيم

الجمهورية العربية المتحدة

جامعة الأزهر

قرر السيد الرئيس جمال عبد الناصر رئيس الجمهورية العربية المتحدة ، في يوم الخميس الثامن عشر من ذي القعدة سنة خمس وثمانين وثلثمائة وألف من الهجرة النبوية الشريفة - وهو يوافق ١٠ من مارس سنة ١٩٦٦ ميلادية - منح السيد محمد برهان الدين صاحب سلطان طائفة البهرة الإسلامية بالهند ، درجة العالمية الفخرية من جامعة الأزهر

وتنفيذا للقرار الجمهوري ، منحت جامعة الأزهر السيد محمد برهان الدين صاحب سلطان طائفة البهرة . درجة العالمية الفخرية في العلوم الإسلامية ، تقديرا لجهوده الخيرة في العمل على توثيق الروابط الكريمة بين المسلمين

والجامعة ترجو للأستاذ العلامة محمد برهان الدين - وقد أعطاه الله شرف الدنيا وفخرها - أن يرزقه بصالح العمل ثواب الآخرة وأجرها ، إن شاء الله . والله سميع مجيب .

القاهرة في يوم الأحد ٢١ من ذي القعدة سنة ١٣٨٥ هجرية - ١٣ من مارس سنة ١٩٦٦ ميلادية

مدير جامعة الأزهر

(توقيع)

أحمد حسن الباقوري



یمن کے کامیاب دورے کے بعد ۱۳۸۱ھ میں سیدنا محمد برہان صاحب کو جناب شاہ سیف الدین (مرحوم) نے منصور الیمن کے لقب سے نوازا۔ یہ تصویر رسم کی ادائیگی کے وقت لی گئی ہے۔



ہز ہولینس اور آغا خان خوش گوار موڈ میں۔



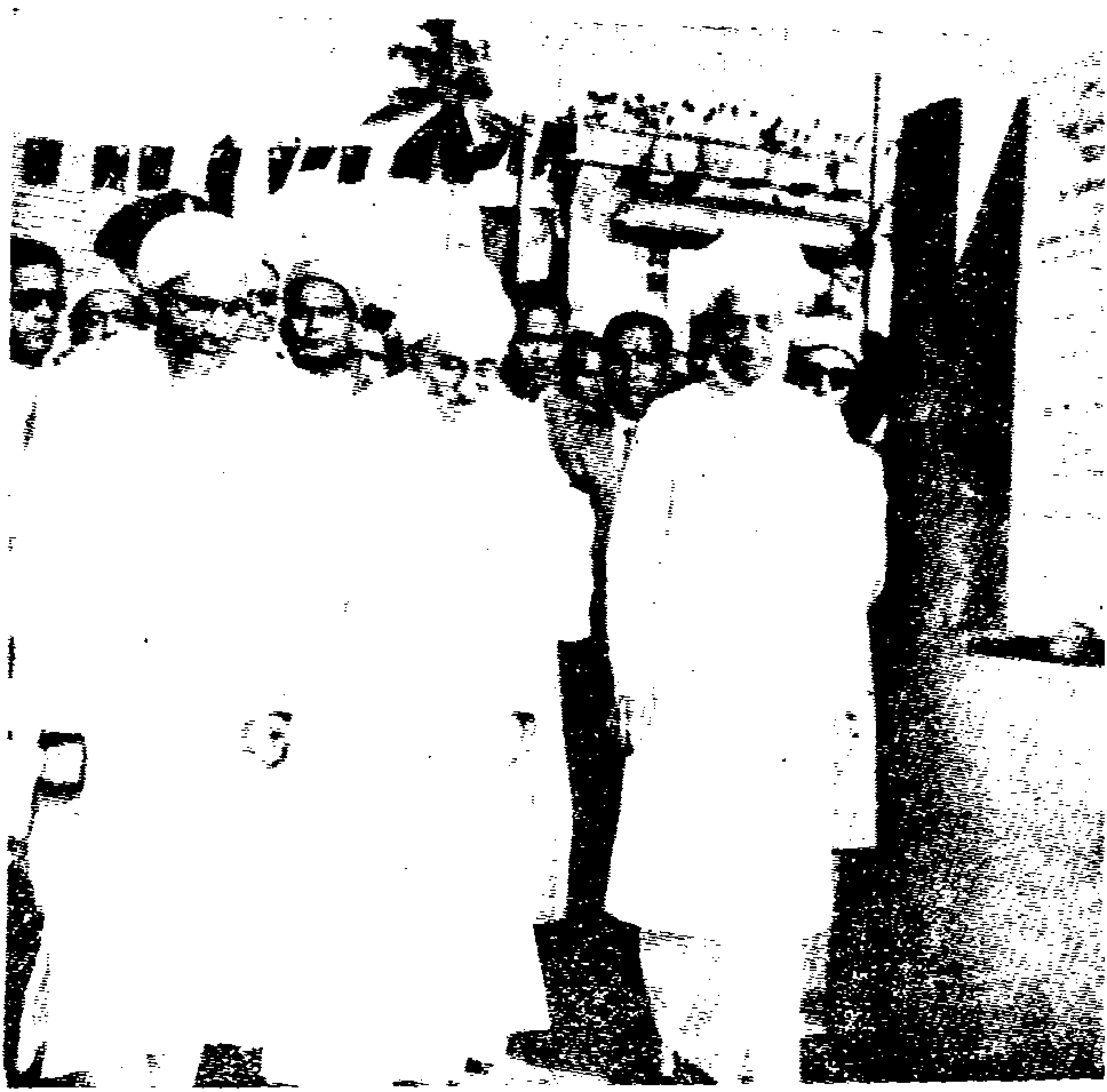
مرحوم سیدنا طاہر سیف الدین صاحب فوآرے کے پاس اخبار کا مطالعہ کرنے میں منہمک ہیں۔ سیدنا برہان الدین صاحب بائیں جانب محوِ خیال ہیں۔

تقدس مآب سیدنا برہان الدین صاحب حضرت امام حسینؓ کے مزار مبارک پر دعا میں مصروف ہیں۔





ہز ہولینس صدر پاکستان کے ساتھ



صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن سیفی گورنمنٹ پولی ٹیکنک وجیکل انسٹی ٹیوٹ کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے۔
تصویر میں ۱۵ ویں والیٔ معظم اور سید ناصر برہان الدین صاحب مع گورنر مہاراشٹر نظر آ رہے ہیں



ہز ہولینس سیدنا برہان الدین صاحب اور ان کے والد ماجد (مرحوم) شاہ ایران رضا شاہ پہلوی کے ساتھ۔



نواب مہدی نواز جنگ، گورنر گجرات الجامعۃ السیفیہ سورت میں منعقد ایک خصوصی تقریب میں سیدنا کے ساتھ



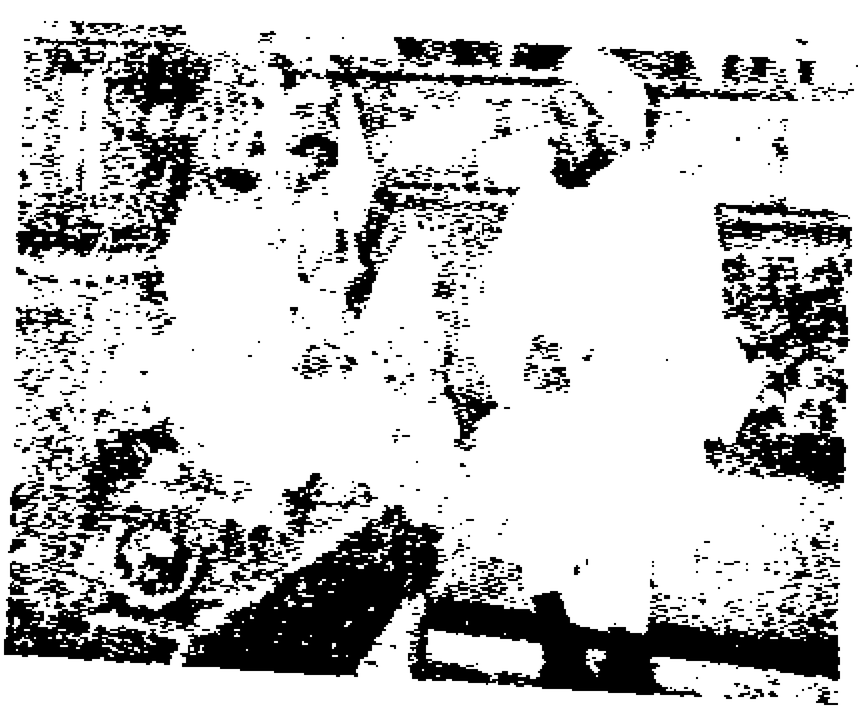
سیدنا برہان الدین صاحب کے لڑکپن کی ایک دلچسپ تصویر۔



دورۂ یمن کے دوران سیدنا برہان الدین صاحب
دلاوری ابرو و جماعت کے تیسرے داعی مطلق سیدنا
حاتم کے مزار مبارک پر۔



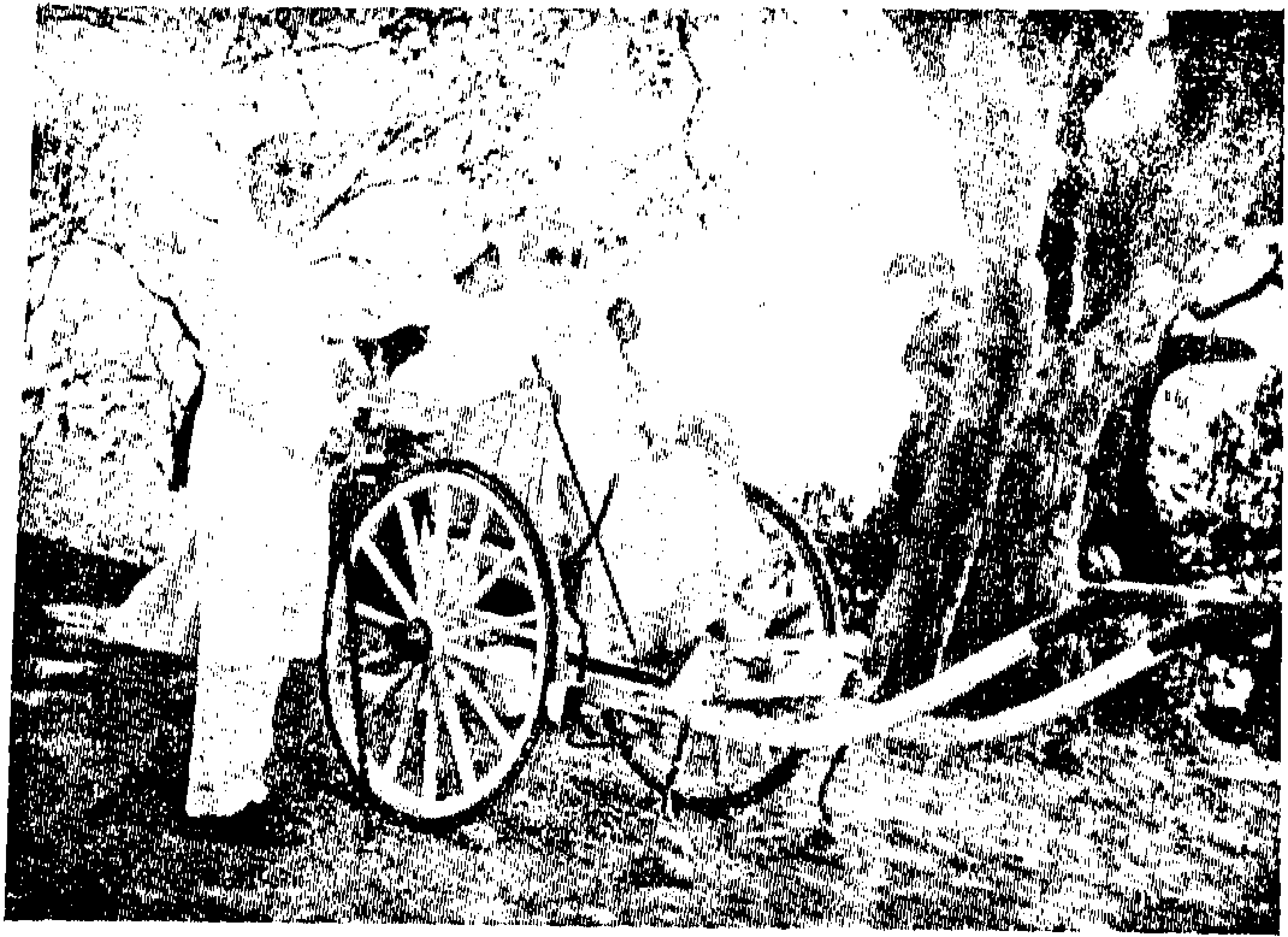
شاہ مسعود کے ساتھ ایک یادگار تصویر



کویت کے حکمران کے ساتھ قصرِ خاص میں۔



آنجہانی وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے ساتھ لی گئی ایک تصویر جب شری نہرو نے ہندوستانی گرومندر میں ٹیچرز ہاسٹل
کا سنگ بنیاد رکھا۔ ساتھ میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب وائس چانسلر صاحب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔



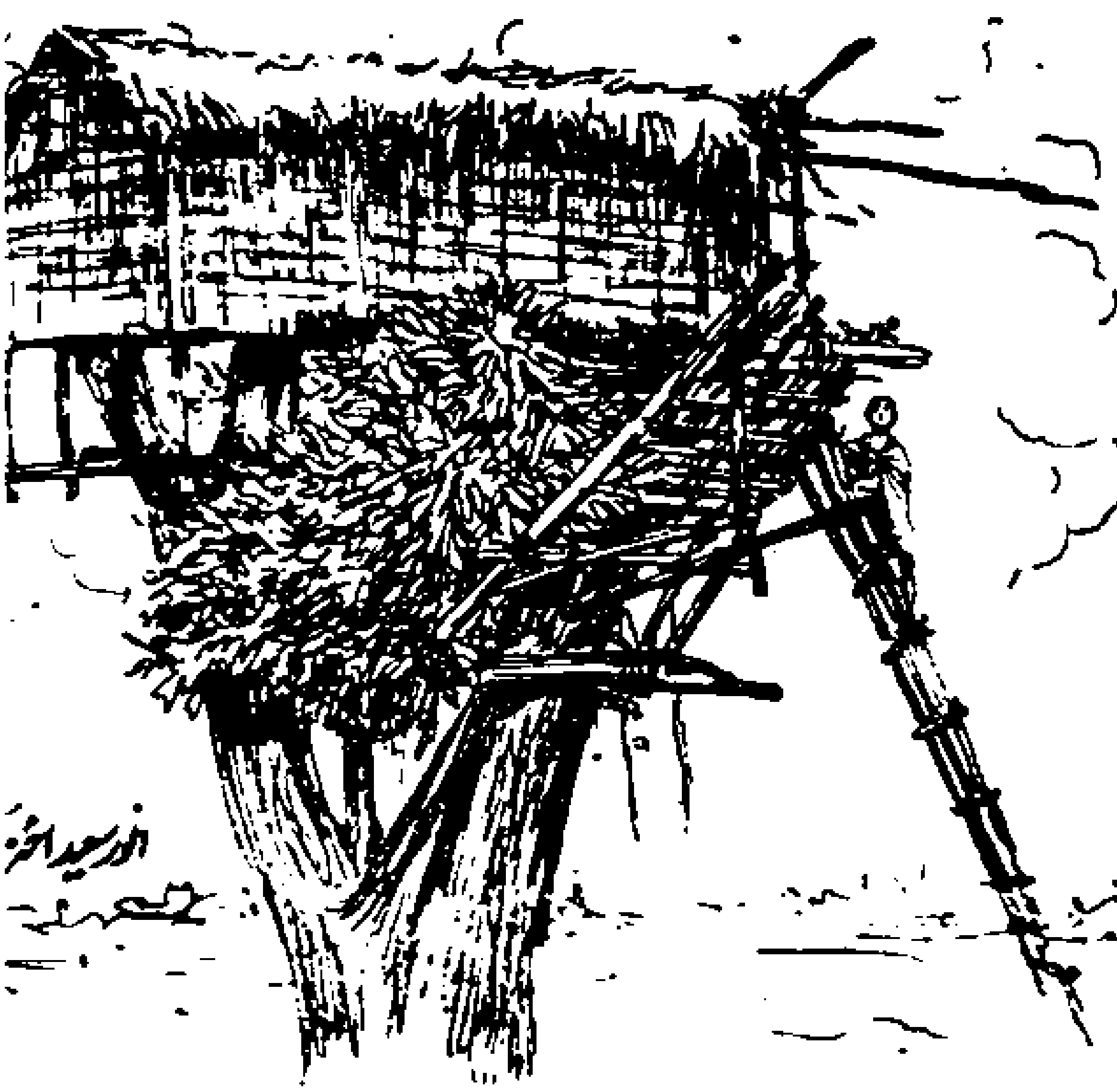
۵۱ ویں داعی مطلق سیدنا ڈاکٹر طاہر سیف الدین صاحب کی آخری تصویروں میں ایک یادگار
تصویر جو میتھران کے سفر کے دوران لی گئی ہے۔ میتھران کے اس سفر نے سیدنا مرحوم کو ہمیشہ
کے لئے جدا کر دیا۔



محرم کے مہینے میں گجراۃ المساجد بمبئی میں وعظ فرماتے ہوئے۔



حضرت امام حسینؓ کے مقبرے کے قریب مبارک
ذرح شریف نصب کرتے ہوئے۔ ذرح شریف پر
کندہ کلمات خود تقدس مآب کی تحریر ہے۔



انسانی گھونسلے

انور سعید اختر

آپ حیران ہوں گے کہ جنوب مغربی ہندوستان کی ریاست ٹراونکور میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اونچے اونچے درختوں پر چھوٹے چھوٹے گھونسلے بنا کر رہتے ہیں۔ ان باشندوں کو یورالی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ جھیل پریار کے چاروں طرف گھنے جنگل میں آباد ہیں۔ انہیں اس پُراسرار ماحول میں زندگی گزارتے ہوئے کئی صدیاں بیت گئی ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ان ہی کے ملک کے کروڑوں باشندے اُن کے حالات، بود و باش اور رسم و رواج سے بے بہرہ ہیں۔ یورالی باشندوں کی مجموعی تعداد تین چار ہزار سے زیادہ نہیں۔ جسمانی طور پر انتہائی جفاکش، سخت جان اور قناعت پسند ہیں۔

بھولے بھالے یورالی باشندے اِس پُرخطر جنگل میں ہر وقت موت سے نبرد آزما رہتے ہیں۔ کبھی قدرت کی ستم ظریفی ان کا منہ چڑاتی ہے اور کبھی خونخوار جنگلی ہاتھی انہیں پاؤں تلے روند ڈالتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی جنگل میں راستا بھول جائے اور شام تک گھر نہ لوٹے تو اگلے روز کسی شیر کی کچھار کے باہر اس کی لاش کے کچھ حصے بکھرے ہوئے نظر آئیں گے۔

سال بھر میں کئی بار اس قدر بارش ہوتی ہے کہ کئی کئی روز تک حدِ نظر تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا ہے۔ اس دوران میں وہ پرندوں کی طرح اپنے گھونسلوں میں رہتے ہیں۔ گھنے اور تاریک جنگل میں پُرپیچ پگڈنڈیوں کا ایک وسیع جال پھیلا ہوا ہے جو چھوٹے چھوٹے بیسیوں دیہات کو آپس میں ملاتی ہیں۔ یہ راستے اس قدر خطرناک ہیں کہ اب تک بہت ہی کم سیاح ان راستوں تک پہنچ سکے ہیں۔

یورالی قبیلے کے تمام افراد درختوں کی چوٹیوں پر گھونسلے نما مکانات بنا کر رہتے ہیں۔ زمین سے چالیس پچاس فٹ بلند گھونسلوں تک پہنچنے کے لیے بانس کی سیڑھیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ پہاڑ کے دامن میں جھیل پریار کے کنارے اِن خوبصورت گھونسلوں کی ایک لمبی قطار بڑا دلفریب منظر پیش کرتی ہے۔ بانس اور کھجور کے پتوں سے بنے ہوئے گھروندے دیکھنے میں بہت ہلکے پھلکے اور کمزور معلوم ہوتے ہیں لیکن انہیں درخت کی چوٹی کے ساتھ شاخوں کو کاٹ کر مضبوطی سے باندھ دیا جاتا ہے اور تند و تیز طوفان اور آندھی سے یہ جھولوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

ان میں بعض مکانات دو دو، تین تین کمروں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان گھونسلوں کی تعمیر میں ایک تیز دھار کی کلہاڑی

استعمال کی جاتی ہے جسے یرالی ہمیشہ اپنی کمر کے ساتھ بندھی ہوئی ٹوکری میں ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ ان کی چھت کھجور کے پتوں سے کچھ اس طرح بنائی جاتی ہے کہ موسلا دھار بارش کے دوران میں پانی کی ایک بوند بھی اندر نہیں جاتی۔

آج تک ایک بھی یرالی نے بھی اپنا مکان زمین پر تعمیر نہیں کیا۔ وہ زمین کو بہت گندا اور غیر صحت مند تصور کرتے ہیں۔ منظرِ قدرت کے دلدادہ ہیں اور ہرے بھرے سرسراتے پتوں اور چہچہاتے پرندوں کے جھرمٹ میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ گھونسلوں میں رہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جنگل میں وحشی جانوروں اور خونخوار ہاتھیوں کی بہتات ہے۔ جو اگر مشتعل ہو جائیں تو پلک جھپکتے ہی پورے گاؤں کو تہس نہس کر ڈالتے ہیں۔

یرالی اپنے چولھے مکان کی سیڑھی کے قریب زمین پر بناتے ہیں۔ جنگل میں بندر اور لنگور دن رات اچھلتے کودتے رہتے ہیں۔ جونہی کسی یرالی عورت کی توجہ دوسری طرف ہوئی یا وہ کوئی چیز لینے کے لیے اوپر مکان میں آئی، اسی وقت بندر یا لنگور آ دھمکتے ہیں اور کھانے پینے کی ساری چیزیں چٹ کر جاتے ہیں۔ لنگور تو چولھے پر رکھی ہوئی ہنڈیا بھی اٹھا کر لے جاتا ہے اور چند قدم دور جا کر زور زور سے چیختا ہے۔ بہت سے لنگور جمع ہو جاتے ہیں پھر وہ سب مل جل کر اسے کھانے لگتے ہیں اور ساتھ ساتھ کنکھیوں سے ہنڈیا کے مالک کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہنڈیا وہیں چولھے کے پاس رکھ دیتے ہیں۔

رہی سہی کسر جنگل کے خونخوار اور مست ہاتھیوں نے پوری کر دی ہے۔ ہفتے عشرے کے بعد ہاتھی اس طرف آ نکلتا ہے اور گاؤں کے تمام باورچی خانوں کو پیوندِ زمین کر دیتا ہے۔ ان میں مست، بدمعاش اور مشتعل ہاتھی بہت خطرناک ہوتا ہے جسے اس کے قبیلے والے باغی قرار دے کر قبیلے سے نکال دیتے ہیں۔ ایسا ہاتھی تھوڑے ہی عرصے میں آدم خور بن جاتا ہے اور انسان کو دیکھتے ہی نگل جاتا ہے۔ یرالی باشندے ان ہاتھیوں سے بہت ڈرتے ہیں اور ذرا سی آہٹ پاتے ہی فوراً گھونسلوں میں جا چھپتے ہیں۔ بعض ہاتھی بہت شریر ہوتے ہیں، وہ جھیل سے سونڈ میں پانی بھر کر لے آتے ہیں اور یرالی عورتوں کی سالن سے بھری ہوئی ہنڈیا میں اُگل دیتے ہیں۔ بعض ہاتھیوں کو پکے ہوئے سالن کھانے کی چاٹ لگ جاتی ہے اور جب بھی موقع ملتا ہے چٹ کر جاتے ہیں۔

کچھ ہاتھی اتنے خونخوار ہو جاتے ہیں کہ سڑک پر راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور سیر و سیاحت یا شکار کی غرض سے آنے جانے والوں کو کاروں میں سے نکال کر کھا جاتے ہیں۔

ٹراونکور سے بنگلور کی سمت کار سے سفر کرتے ہوئے آپ دیکھیں گے کہ اس سڑک پر میلوں کے نشان سیاہ رنگ کے پتھروں پر لگے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مست ہاتھی سفید پتھر دیکھتے ہی مشتعل ہو جاتے ہیں اور انہیں نکال باہر پھینکتے ہیں۔ ایک عرصے تک ریاست میسور کے حکام اس بات سے بہت پریشان رہے۔ آخر کار وہ اس کا حل ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے آج تک کسی ہاتھی نے کالے پتھروں کو نہیں چھوا۔

یرالی باشندے سادہ لوح اور مہمان نوازی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ عورتیں گھر کے کام کاج کے علاوہ کھیتوں میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔ گھونسلوں کے نیچے آلو، کیلے، مکئی، گندم



اور چاول کاشت کرتے ہیں شکار کے بے حد شوقین ہیں اور باہر سے آنے والے شکاریوں کی رہنمائی کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں مچھلی اور



چاول ان کا من بھاتا کھانا ہے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی جھیل پر بارشی تیلیاں پکڑانے میں غیر معمولی مہارت رکھتے ہیں

جنگل کا بہت بڑا حصہ کاٹ کر یہاں کی مصنوعی جھیل تیار کی گئی ہے جھیل کی سطح پر دن رات سکوت مرگ طاری رہتا ہے۔ گھنے جنگل کے درمیان کشتی میں سیر کرتے ہوئے آدمی اپنے آپ کو طلسماتی دنیا میں گھومتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

آج بھی اس قبیلے کے لوگ بانس کے ٹکڑوں کو رگڑ کر آگ جلاتے ہیں۔ شیشے کے ٹکڑے رگڑ کر تیز کر لیتے ہیں اور اس سے شیشہ بناتے ہیں۔ قحط اور خشک سالی کے دوران میں انہیں جنگلی پھلوں اور انگوروں سے پیٹ بھرنا پڑتا ہے۔

اس قبیلے کی یہ رسم بہت دلچسپ ہے کہ دولہا کو شادی سے پہلے اپنا گھونسلا الگ بنانا پڑتا ہے اس گھروندے کی تعمیر میں اس کے بہن بھائی، والدین اور دوسرے رشتے دار ہاتھ بٹاتے ہیں بعض والدین گھونسلا لڑکی کو جہیز میں دے دیتے ہیں لیکن اکثر دولہا اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے مکان کو ترجیح دیتے ہیں۔

مظہر امام

غزل

اپنے برستے ہوئے زخموں کی قبا لایا ہوں
زندگی! میری طرف دیکھ! "میں" آیا ہوں

تشنگی حد سے سوا تو نہ تھی مے خواروں کی
جانے کیوں جام اُٹھاتے ہوئے تھرّایا ہوں

کام آئی ہے وہی زلف جو میری نہ ہوئی
وقت کی دھوپ میں جس وقت میں کمھلایا ہوں

خیریت پوچھنے والے ہیں بہت سنجیدہ
جرم اتنا ہے کہ اِک شوخ کا ہمسایہ ہوں

صبح ہو جائے تو اس پھول کو دیکھوں کہ جسے
میں شبستانِ بہاراں سے اُٹھا لایا ہوں

عصرِ نو! مجھ کو نگاہوں میں چھپا کر رکھ لے
ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا سرمایہ ہوں





جنگل کی ایک رات

• جیمز بارٹن اور الیسا بارٹن

مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ میں اپنی شکاری زندگی کا کوئی ناقابلِ فراموش واقعہ قلم بند کروں۔ اس فرمائش کے جواب میں حیران ہوں کہ کیا لکھوں اور اپنی شکاری زندگی کا کون سا " ناقابلِ فراموش " واقعہ ضبطِ تحریر میں لاؤں۔ اس کا مطلب یہ نہ سمجھ لیجیے کہ میری زندگی میں اس قسم کا کوئی واقعہ سرے سے موجود نہیں۔ میں تو اس لیے پریشان ہوں کہ سینکڑوں واقعات و حادثات میں سے کس کو " ناقابلِ فراموش " قرار دوں؟ اپنی تیس سالہ شکاری زندگی کا ایک



ایک دن میری نگاہ میں ہے اور جب میں ان خطرناک اور جان لیوا مہموں پر غور کرتا ہوں تو خود ہی حیرت سے اپنے کارناموں پر عش عش کرنے لگتا ہوں۔ کینیا، یوگنڈا اور نیروبی کے آدم خور، کانگو کے بن مانس، ملایا کے شیر، ہمالہ کے دامن



میں بسنے والے
ریچھ، چیتے اور خونخوار درندے
حیل نے مگرمچھ، غرض کس کس کا ذکر کروں ؟ اتفاق کی بات کہ میری
شادی ایسی عورت سے ہوئی، جو شکار اور مہم جوئی کے مشغلوں کی مجھ سے زیادہ شوقین ہے۔ اُس کا
باپ تقسیم ہندستان سے بہت عرصہ پہلے ڈویژنل فارسٹ آفیسر رہ چکا تھا اور وہاں اُس نے بے شمار آدم خور
شیر اور چیتے ہلاک کیے تھے، چناں چہ میری بیوی ایلسا نے بھی جنگلوں کی فضا ہی میں آنکھ کھولی اور وہیں پرورش پائی۔ وہ
بہترین نشانہ باز اور نڈر عورت ہے۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ مغل بادشاہ جہانگیر کو شیر کے شکار کا بڑا شوق تھا اور اُس کی
چہیتی بیگم نورجہاں بھی نہایت بہادر اور نڈر خاتون تھی اور اس نے بارہا شکار کی مہموں میں بادشاہ کی جان بچائی۔
بدقسمتی سے میں بادشاہ تو نہیں اور نہ میری بیوی کو ملکہ نورجہاں سے کوئی نسبت ہے، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ایلسا
نے کئی مرتبہ میری جان بچائی ہے۔ میری بیوی نے فرصت کے زمانے میں شکار کے اُن واقعات کو قلم بند کرنا شروع کیا تھا، جو مجھے اور
اُسے پیش آئے تھے۔ انھی یادداشتوں کی مدد سے میں پڑھنے والوں کی خدمت میں ایک کے بجائے دو ناقابلِ فراموش واقعات پیش
کرتا ہوں۔ ایک کارنامہ ایلسا کا ہے اور دوسرا مجھ سے منسوب ہے۔
یہ اُس زمانے کا ذکر ہے، جب میں کینیا میں گیم وارڈن کے عہدے پر فائز تھا اور چند روز کے لیے ایک ضروری کام
سے نیروبی گیا ہوا تھا۔ میری غیر حاضری میں ایلسا نے جو کارنامہ سرانجام دیا، وہ اُسی کے الفاظ میں سُنیے :
" ستمبر کا پہلا ہفتہ بھی گزر گیا اور جیمز کا کوئی خط نہیں آیا، حالاں کہ اُسے میں نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ نیروبی
پہنچتے ہی اپنی خیریت کا تار بھیجنا، لیکن تار تو ایک طرف، اُس نے خط تک بھیجنے کی تکلیف گوارا نہ کی۔ بہرحال میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ

خواہ کچھ ہو، میں بھی اُسے خط نہیں لکھوں گی۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس روز جمیز گیا ہے اُسی روز رات کے وقت، جب کہ میں اپنے کوارٹر میں بستر پر لیٹی تھی، میرے کانوں میں ایسی آوازیں آئیں، جیسے کچھ فاصلے پر عورتیں اور بچے چیخیں مار مار کر رو رہے ہیں۔ میں کان لگا کر یہ آوازیں سُننے لگی۔ تھوڑی دیر بعد میرا ہندوستانی خانساماں اور اردلی جس کا نام راجن تھا، کمرے میں داخل ہوا اور اُس نے بتایا کہ ابھی ابھی ایک شیر مزدوروں کے جھونپڑوں میں داخل ہوا اور جومو کی لڑکی کو ہلاک کر کے چلا گیا۔

یہ سُنتے ہی میں لپک کر اُٹھی اور اپنی رائفل اُٹھا کر راجن کی معیت میں جومو کی جھونپڑی کی طرف روانہ ہوئی۔ جومو کینیا کے گیم ڈیپارٹمنٹ کا مُلازم اور اِرد گِرد کے عِلاقے کی حفاظت کا ذمّے دار تھا اور نہایت تجربے کار اور بہترین شکاری تسلیم کیا جاتا تھا۔ مجھے سخت تعجب ہوا کہ شیر کس طرح اس کی لڑکی کو گھر میں گُھس کر ہلاک کر گیا۔ ایسا اتفاق اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ کوئی درندہ اِس چھوٹی سی بستی میں داخِل ہوا ہو۔

ہمارے کوارٹر نما بنگلے سے یہ بستی دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی اور سب سے پہلے جومو ہی کا کچّا مکان بنا ہوا تھا۔ اگرچہ رات تاریک تھی، لیکن بستی کے مکانوں اور جھونپڑوں میں تیل اور چربی کی شعلیں جل رہی تھیں۔ بجلی مُوجود تھی، لیکن سرکاری طور پر اِس علاقے میں کسی اشد ضرورت کے بغیر بجلی کے بلب روشن کرنے کی سختی سے ممانعت تھی۔ میں نے دُور ہی سے دیکھ لیا کہ جومو کے گھر کو مقامی باشندوں اور دوسرے مُلازموں نے گھیر رکھا ہے۔ جومو وہاں نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ درندے کے تعاقب میں جنگل کی طرف نکل گیا ہے۔

مجھے دیکھ کر عورتوں اور لوگوں نے راستہ چھوڑ دیا۔ جومو کی سترہ سالہ لڑکی بجامی کی لاش مکان کے صحن میں پڑی تھی اور چاروں طرف تازہ تازہ خُون ہی خُون پھیلا ہوا تھا۔ لڑکی کی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے خوف کا اظہار ہوتا تھا اور اس کا مُنھ کُھلا ہوا تھا۔ اُس کے چیچک دار سیاہ چہرے اور کُھلے ہوئے مُنھ سے جھانکتے ہوئے سفید دانت دیکھ کر میرے بدن میں جُھرجُھری سی دوڑ گئی۔ زخم کا ایک گہرا گھاؤ لڑکی کی گردن پر تھا، جس میں سے خُون اُس وقت بھی رِس رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شیر نے پُوری قوت سے پنجہ اُس کی گردن پر مارا تھا۔ میں نے جُھک کر دیکھا تو پتہ چلا کہ لڑکی کی گردن جسم سے تقریباً علیٰحدہ ہو چکی ہے۔ اس کے کپڑے بھی پَھٹے ہوئے تھے۔ پنڈلیوں، بازوؤں اور سینے پر بھی شیر کے پنجوں کے نِشانات نمایاں تھے۔

شیر نے جب لڑکی پر حملہ کیا تو وہ باہر صحن میں سو رہی تھی اور گھر کے دوسرے افراد اندرونی حصّے میں تھے۔ شیر دبے پاؤں کُھلے دروازے سے اندر آیا اور جب وہ لڑکی کی طرف بڑھا تو اُس کی آنکھ کُھل گئی۔ شیر کو دیکھ کر لڑکی کے اوسان خطا ہو گئے اور اس سے پیشتر کہ وہ اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر سوچتی، شیر نے اُچھل کر اس پر حملہ کیا اور اُسے گھسیٹ کر لے جانے کی کوشش کی، مگر اُسی لمحے لڑکی کا باپ جومو چیختا ہوا باہر نکلا اور اُس نے پانی سے بھرا ہوا ایک برتن اُٹھا کر اُس کی طرف پھینکا۔ شیر نے لڑکی کو فوراً چھوڑ دیا اور غراتا، گرجتا ہوا بھاگ گیا۔ لڑکی نے زخموں کی تاب نہ لا کر فوراً ہی دَم توڑ دیا۔

جومو غصّے کے عالم میں اُسی وقت اپنی رائفل اُٹھا کر شیر کے تعاقب میں روانہ ہو گیا اور اب ایک گھنٹہ ہونے کو آیا، وہ جنگل سے نہیں لوٹا۔ جومو کے گھر کی عورتیں، پاس پڑوس کے لوگ سب ہی متفکر اور افسردہ تھے۔ بجامی کے بہن بھائی اونچی آواز میں رو رہے تھے۔ میں نے اُن کو تسلی دی اور کہا کہ جو ہونا

تھا، ہوگیا شیر نے اب اِدھر کا راستہ دیکھ لیا ہے، اس لیے سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔ چناں چہ فوراً ہی چند لوگ جنگل کے قریب چلے میں گئے اور خار دار جھاڑیاں اکھیڑ اکھیڑ کر لانے لگے اور دیکھتے دیکھتے انھوں نے اپنی جھونپڑیوں کے گرد ان کا حصار سا باندھ دیا۔

رات کے وقت جنگل میں جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لیے میں نے اس معاملے کو صبح پر ملتوی کر دیا۔ یہ خیال بھی تھا کہ صبح تک جومو واپس آجائے گا اور شیر کے بارے میں کوئی خبر سنائے گا۔ میں اپنے کوارٹر میں چلی آئی اور بندھے ہوئے کتوں کو آزاد کر دیا۔ دروازے اور کھڑکیاں اچھی طرح بند کر دیے۔ مجھے معلوم تھا کہ شیر اپنے شکار کو نہیں لے جا سکا اور وہ جھنجھلایا ہوا بیٹھا ہوگا اور لازماً ادھر کا رخ کرے گا۔

اس حادثے سے کوئی ایک ہفتے قبل ہماری بستی کے جنوب میں، چار میل کے فاصلے پر ایک مزدور کو بھی شیر نے اپنا نوالہ بنایا تھا اور غالباً یہ وہی شیر تھا جس کے منہ کو اب انسانی خون لگ گیا تھا اور وہ جنگلی جانوروں کو چھوڑ کر انسانوں کی بستی میں دراز گھس آیا تھا۔

نیروبی جاتے وقت جیمز نے مجھے سختی سے ہدایت کی تھی کہ اس کی واپسی تک اپنے سیر و شکار کے مشغلے ملتوی رکھوں اور جنگل میں زیادہ دور جانے سے پرہیز کروں، لیکن بھائی کے نواب ہلاک ہو جانے سے میرے تن بدن میں آگ سی لگ رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ بدنصیب لڑکی اکثر میرے پاس آیا کرتی تھی اور میرے کاموں میں خوشی خوشی ہاتھ بٹاتی تھی۔ اس نے اچھی خاصی انگریزی بھی سیکھ لی تھی اور ایک روز پہلے ہی وہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میرے ساتھ انگلستان ضرور جائے گی۔

رات کو کئی مرتبہ میں نے اپنے اردلی کو جومو کے گھر بھیجا، مگر ہر بار وہ آ کر یہی بتاتا کہ جومو واپس نہیں آیا۔ یوں کر میری تشویش میں اور اضافہ ہوگیا، تاہم مجھے یہ اطمینان تھا کہ جومو نہایت تجربے کار اور نڈر شکاری ہے اور آسانی سے آدم خور کے ہتھے نہیں چڑھ سکتا۔ جیمز نے مجھے جنگل میں جانے سے اس لیے منع کیا تھا کہ میں ابھی دنوں ایک خوں خوار چیتے کا نوالہ بنتے سے بال بال بچی تھی۔ قصہ یہ تھا کہ میں چند حبشی عورتوں کے ساتھ ان کی ایک خاص رسم کا تماشہ دیکھنے کے لیے جنگل میں گئی۔ یہ عورتیں بیل گاڑی پر بیٹھی ہوئی تھیں اور گاڑی بان نہایت طاقت ور اور لمبا تڑنگا جوان تھا۔ میں اپنے پالتو ہاتھی "گشاتو" پر سوار تھی۔ گشاتو مقامی زبان میں ہر ایسے جانور کو کہتے ہیں، جس کی پیدائش تو جنگل میں ہوئی ہو، لیکن پرورش انسانوں میں پائی ہو۔

گشاتو بہت چھوٹا تھا، جب ایک شخص اسے جنگل سے پکڑ کر لایا اور ہمارے ہاتھ بیچ گیا۔ میں نے اس کی نہایت توجہ سے اور محبت سے پرورش کی اور اب وہ میرے بغیر ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رہ سکتا تھا۔

میں گشاتو پر بیٹھی ہوئی ان عورتوں سے باتیں کرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ صبح کا سہانا وقت تھا اور جنگل کا منظر نہایت دل آویز اور فرحت بخش۔ گنجان درختوں کی شاخوں اور پتوں میں چھپے ہوئے پرندے چہچہا رہے تھے اور کہیں کہیں بندر اچھل کود میں مصروف تھے۔ دفعتاً گاڑی کے آگے جتے ہوئے دونوں بیل رک گئے۔ گاڑی بان نے انھیں آگے بڑھنے کے لیے للکارا اور اپنی مضبوط چھڑی سے انھیں پیٹا تو آگے بڑھنے کے بجائے یہ طاقت ور بیل پیچھے ہٹنے لگے اور پھر اڑ گئے۔

بیلوں کا یوں رک جانا کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ گاڑی بان سمجھ گیا کہ قریب ہی کوئی درندہ موجود ہے۔ اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور

گشاتو کی گردن پر تھپکی دے کر اُسے آگے بڑھایا۔ ابھی میں گاڑی سے کوئی بیس پچیس فیٹ دور گئی تھی کہ گشاتو سونڈ اُٹھا کر چنگھاڑا، اُس کی آواز سے جنگل لرز گیا اور پھر فوراً ہی جھاڑیوں میں سے ایک عجیب اور قد آور چیتے نے چھلانگ لگائی۔ اِتفاق دیکھیے کہ میرے پاس سوائے پستول کے سوا اور کوئی ہتھیار نہ تھا، لیکن چیتا شاید ہاتھی سے ڈر کر میری طرف نہ آیا اور گاڑی کی طرف لپکا۔ چیتے کو دیکھ کر بَیل دہشت زدہ ہو کر اُچھلے اور گاڑی اُلٹ گئی۔

چشم زدن میں بپھرے ہوئے چیتے نے گاڑی بان پر حملہ کیا اور پنجہ مار کر اُسے گرا دیا، لیکن بیلوں کی اُچھل پھاند، حبشی عورتوں کی چیخ پکار اور گشاتو ہاتھی کی چنگھاڑ نے چیتے کو بدحواس کر دیا۔ وہ ہولناک انداز میں گرج رہا تھا۔ اتنی دیر میں میں نے اپنے پستول سے نشانہ لے کر فائر کیا، نشانہ خطا گیا اور چیتا بجلی کی مانند گشاتو کی جانب آیا اور اس کی سونڈ پر پوری قوت سے حملہ کیا۔ ہاتھی گھبرا کر ایک طرف کو جھکا اور میں دوسری جانب لُڑھک گئی، لیکن وفادار ہاتھی نے فوراً ہی مجھے اپنی سونڈ میں پکڑ کر پیچھے پھینک دیا۔ اس اثنا میں زخمی گاڑی بان اوسان بحال کر کے اُٹھا اور اپنا نیزہ چیتے کی طرف پھینکا۔ چیتے نے یہ وار بھی خالی دیا اور چھلانگ کر دوبارہ گاڑی بان کی طرف لپکا اور آناً فاناً اسے چیر پھاڑ ڈالا اور غصّے سے گرجتا ہوا جنگل میں غائب ہو گیا۔

یہ تھا وہ حادثہ جس کے بعد جیم نے مجھے سختی سے دھمکایا تھا کہ آئندہ غیر محتاط ہو کر میں جنگل میں نہ جاؤں اور میں نے وعدہ بھی کر لیا تھا، لیکن بھامی کی موت کے بعد میرا ذہن یہ وعدہ قطعی فراموش کر چکا تھا اور میں علی الصباح جنگل میں جانے کا مصمم ارادہ کر چکی تھی۔

سورج نکلنے سے پہلے ہی میرے کمرے کا دروازہ کسی نے آہستہ سے کھٹکھٹایا۔ میں نے پوچھا "کون ہے" تو جواب میں کسی عورت کے ہچکیاں لے لے کر رونے کی آواز سُنائی دی، پھر راجن نے جواب دیا: "میم صاحب، جومو کی بیوی آپ سے کچھ کہنے آئی ہے۔ ذرا اس کی بات سُن لیجیے۔"

میں نے جلدی سے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ جومو کی بیوی کا سوگوار اور اُداس چہرہ میرے سامنے تھا۔ اُس نے روتے ہوئے بتایا کہ جومو ابھی تک گھر نہیں لوٹا اور سب لوگ یہی کہہ رہے ہیں کہ اُسے شیر نے ہڑپ کر لیا ہے۔"

یہ سُن کر میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں نے راجن کو حکم دیا کہ وہ بستی کے تمام شکاریوں کو تیار رہنے کا پیغام بھجوا دے اور گشاتو کو ضروری سامان سے لیس کر کے فوراً لے آئے۔ ہم آدھ گھنٹے بعد جنگل میں جومو کو ڈھونڈنے جائیں گے۔ جومو کی بیوی کو میں نے تسلی دے کر رخصت کیا اور جلدی جلدی حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر خود ہی ناشتہ تیار کیا۔ اتنے میں گشاتو آچکا تھا۔ چند منٹ بعد بستی کے چار شکاری، جن کے ہاتھوں میں لمبے لمبے نیزے تھے اور جو جنگل کے چپے چپے سے آگاہ تھے، باہر میرا انتظار کر رہے تھے۔

ناشتہ کرتے ہوئے میں جومو کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ کیا واقعی وہ بھی جنگل میں درندے کے منہ کا لقمہ بن گیا ہوگا؟ عقل اسے باور نہیں کرتی تھی۔ جومو نہایت بہادر اور تجربے کار آدمی تھا۔ اس کی عمر تقریباً پچاس سال تھی۔ وہ انہی جنگلوں میں پیدا ہوا، پلا، بڑھا اور اس عمر کو پہنچا۔ وہ یہاں کے درندوں، پرندوں اور دوسرے ہزار ہا جانوروں کی عادات و خصائل اور نفسیات کو خوب جانتا پہچانتا تھا۔ ایسا شخص آسانی سے درندے کا شکار نہیں ہو سکتا، لیکن ناگہانی حادثے بھی تو تجربے کار اور نڈر لوگوں ہی کو پیش آتے ہیں۔ پھر مجھے خیال آیا، ممکن ہے وہ شیر کے تعاقب میں بہت دور نکل گیا ہو اور

جنگل کے مشرقی حصے میں "میلاما" نامی بستی میں ٹھہر گیا ہو، جہاں اس کے رشتے دار رہتے ہیں۔

چاروں شکاریوں کے حوصلے بلند تھے اور وہ سب کے سب درندے سے انتقام لینے پر تلے ہوئے تھے۔ میں نے انھیں بیل گاڑی پر سوار ہونے کی ہدایت کی، چوں کہ کچھ معلوم نہ تھا کہ جومو کو تلاش کرنے کے لیے ہمیں جنگل میں کتنی دور جانا پڑے گا۔ گشاتو نے مجھے دیکھ کر خوشی سے سونڈ اٹھا کر سلام کیا اور جھومنے لگا۔ میں نے اس کی سونڈ پر تھپکی دی اور اس نے مجھے آہستہ سے اپنی سونڈ میں لپیٹ کر پشت پر بٹھا لیا۔ میرے پاس پستول کے علاوہ اعشاریہ پانچ سو کی رائفل تھی۔

جب ہم جنگل کی طرف روانہ ہوئے تو ہمیں بہت سے مقامی باشندوں کی ٹولیاں جنگل میں کام کرتی دکھائی دیں اور سب ہی نے جومو کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ اپنا کام چھوڑ دیں اور جومو کو تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ یہ سن کر وہ نہایت سرگرمی سے گھنے جنگل میں پھیل گئے اور جومو کا نام لے لے کر آوازیں دینے لگے۔

تین گھنٹے میں ہم نے جنگل کے اندر تقریباً پندرہ میل کا فاصلہ طے کر لیا۔ سورج، اگرچہ آسمان پر پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا، لیکن جنگل اتنا گھنا تھا کہ اس کی کرنیں بمشکل درختوں کی شاخوں اور گتھی ہوئی ٹہنیوں سے اپنا راستہ تلاش کرتی ہوئی زمین تک پہنچ پاتی تھیں۔ راستے میں دو مرتبہ ہم نے ہلکے ہلکے شیر کے غرانے کی آوازیں سنیں، لیکن مجھے تو اس وقت شیر سے زیادہ جومو کی فکر تھی۔ اسے تلاش کرنا بے حد ضروری تھا۔

دن کے گیارہ بجے گشاتو ہمیں لے کر ایک پایاب ندی تک جا پہنچا۔ تھکن کے باعث ہم سب بری طرح نڈھال تھے اور گشاتو بھی آرام کرنے کے لیے بے چین تھا۔ شکاریوں نے گاڑی روک کر بیلوں کو کھول دیا اور وہ گھاس چرنے لگے۔

گشاتو اپنے قریب پانی دیکھ کر بے قرار ہو گیا۔ اس نے مجھے جلدی سے اتارا اور تیزی سے پانی میں گھس گیا اور دیر تک نہاتا رہا۔ جب میں نے اسے پانی سے باہر نکلنے کے لیے آواز دی تو اس نے شرارت سے اپنی سونڈ میں پانی بھر کر میری جانب پھینکا۔ تھوڑی دیر سستانے کے بعد میں نے اپنی رائفل سنبھالی، راجن اور ایک شکاری کو رہبری کے لیے ساتھ لیا اور سیر کے لیے ایک طرف نکل گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ سیاہ فام شکاری ازحد چوکنا اور خبردار ہے اور کبھی کبھی وہ منھ اوپر اٹھا کر ہوا میں کچھ سونگھتا، معنی خیز انداز میں گردن ہلاتا، کچھ رکتا، سوچتا اور پھر آگے بڑھ جاتا۔

میں اس کی ان حرکتوں کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ ابھی ہم ندی کے بائیں کنارے پر بمشکل نصف فرلانگ ہی گئے تھے کہ حبشی شکاری کے حلق سے سیٹی کی مانند ایک تیز چیخ نکلی اور پھر اس کا طاقت ور بازو حرکت میں آیا، نیزہ سنسناتا ہوا ایک جھاڑی کی طرف گیا۔ جھاڑیوں میں چھپا ہوا شیر خوف ناک گرج کے ساتھ اچھلا اور دھاڑتا ہوا ایک جانب بھاگا۔ ایک ثانیے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے خوف سے خون میری رگوں میں جم گیا ہے، لیکن راجن کے چیخنے پر میں نے سنبھل کر رائفل سیدھی کی اور پے در پے دو گولیاں چلائیں۔ دوڑتا ہوا شیر ایک بار پھر اچھلا اور پہلے سے زیادہ زوردار آواز میں گرجتا ہوا نہ جانے کہاں نکل گیا، البتہ دیر تک اس کے دھاڑنے کی آوازیں آتی رہیں۔ شیر کی دھاڑ اور فائروں کے دھماکے سے جنگل کی زندگی میں حشر برپا ہو گیا۔ ہزارہا پرندے چیختے ہوئے فضا میں چکر کاٹنے لگے۔ بندروں، گیدڑوں اور سوروں نے چلا چلا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔

فائروں کی آواز سن کر بقیہ شکاری بھی دوڑتے ہوئے ہماری طرف آئے اور جب انھوں نے دیکھا کہ میں صرف معمولی

ہوں تو اُن کی جان میں جان آئی۔ جھاڑیوں کا معائنہ کرنے سے پتہ چلا کہ شکاری کے نیزے نے شیر کو زخمی کر دیا ہے۔ کیوں کہ تازہ خون وہاں پھیلا ہوا تھا۔ نیزہ بھی جھاڑیوں میں پھنسا ہوا پایا گیا۔

نیزہ مقامی شکاریوں کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اور ان کا نشانہ شاذ ہی خالی جاتا ہے۔ اگرچہ یہاں کے اکثر باشندے رائفل اور بندوق چلانے کا شوق رکھتے ہیں، لیکن ان کا کہنا ہے کہ وہ جنگلی درندوں کو اپنے قدیم ہتھیاروں کے ذریعے آسانی سے شکار کر سکتے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ یہ وہی شیر ہے جس نے گزشتہ رات جومو کی زکی کو ہلاک کیا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ اس نے موقع پاکر جومو کو بھی مار ڈالا ہو اور اس کی لاش کہیں قریب ہی پڑی ہو۔ یہ سوچ کر میں نے شکاریوں کو ہدایت کی کہ وہ آس پاس کی جھاڑیوں کو اچھی طرح دیکھیں، ممکن ہے جومو کا سراغ مل جائے۔

شکاری دیر تک جنگل میں پھرتے رہے۔ سورج آہستہ آہستہ مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ میں نے مایوس ہو کر واپس جانے کا ارادہ کیا اور گشاتو پر سوار ہونے ہی والی تھی کہ ایک شکاری دوڑتا ہوا میرے پاس آیا اور بولا:

"جومو مل گیا ..... جومو مل گیا۔"

"کہاں ہے؟" میں نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

"یہاں سے کچھ فاصلے پر ان پہاڑی ٹیلوں کے پیچھے، جہاں ملکانا قبیلے کے لوگ رہتے ہیں۔"

آدھ گھنٹے بعد میں اپنے ہاتھی پر سوار وہاں پہنچ گئی۔ ندی سے یہ پہاڑی ٹیلے کوئی تین میل کے فاصلے پر واقع تھے اور ان کے ارد گرد ملکانا قبیلے کی ایک چھوٹی سی آبادی تھی۔ یہ ٹیلے جنگل کے ایک سرے پر پھیلے ہوئے تھے اور ان کے اندر تاریک غاروں میں ہزاروں چمگادڑیں رہتی تھیں۔ کبھی کبھی درندے بھی ان غاروں میں پناہ لیتے تھے۔ ایک ٹیلے کے قریب لمبی گھاس میں جومو کی لاش پڑی تھی۔ لاش اس حالت میں دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ درندے نے اس کی گردن نوچ کر الگ کر دی تھی اور نچلا آدھا دھڑ تقریباً ہڑپ کر لیا تھا۔ سرخ رنگ کی وہ چادر، جو جومو گزشتہ روز پہنے ہوئے تھا، وہیں ایک درخت کی شاخ میں اُلجھی ہوئی پائی گئی اور اسی چادر کو دور سے دیکھ کر شکاریوں نے جومو کی لاش کا پتہ لگایا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شیر نے اپنا پیٹ بھرنے کے بعد لاش کو یہیں چھوڑ دیا اور بعد ازاں گیدڑوں نے اس پر دانت تیز کیے ہیں۔ لاش کے اوپر ہزارہا جنگلی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور اتنی بدبو تھی کہ میرے لیے وہاں کھڑے رہنا دوبھر ہو گیا۔ میں نے دو آدمیوں سے کہا کہ وہ لاش اٹھا کر کسی محفوظ مقام پر رکھ دیں۔

دو شکاری اس کام کو سرانجام دینے کے لیے آگے بڑھے اور جوں ہی نیچے جھکے، ایک شکاری کے حلق سے دل دوز چیخ نکلی اور وہ وہیں گر گیا۔ اس کی چیخ اتنی ڈراؤنی تھی کہ بقیہ شکاری دہشت زدہ ہو کر بھاگ نکلے اور مجھے بھی بدحواس ہو کر دور ہٹنا پڑا۔ وفادار ہاتھی نے فوراً مجھے اپنی پشت پر بٹھایا اور کافی پرے ہٹ گیا۔ وہ بار بار سونڈ کو گردش دے رہا تھا۔ دفعتاً راجن اپنی ہندستانی زبان میں چلّایا، "سانپ ---"

اب میں نے دیکھا کہ ایک مہیب سانپ جس کی لمبائی کم از کم پانچ فیٹ ہو گی، اپنا پھن پھیلائے جومو کی لاش کے قریب جھوم رہا ہے۔ اس کا رنگ بھی انوکھا تھا۔ سر بالکل سرخ اور جسم پر زرد دھاریاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے احتیاط سے نشانہ لیا اور لبلبی دبا دی۔ گولی سانپ کے سر پر لگی اور اس کے پرخچے اُڑ گئے۔ سانپ کے ہلاک ہو جانے پر بھی کوئی شکاری جومو کی لاش کے قریب جانے پر تیار نہ تھا، لہٰذا مجھے خود ہی آگے بڑھنا پڑا۔ سانپ نے جس شکاری کو ڈسا تھا وہ اسی طرح بے حس و حرکت

میں نے جھک کر دیکھا تو اُس کا پورا جسم نیلا پڑ گیا تھا، گردن
ں اُبھری ہوئی تھیں، آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر نکل
ہیں، باچھوں سے پانی بہہ رہا تھا اور اُس میں زندگی کی
ق باقی نہ تھی۔

جومو کی موت کا حقیقی راز اب میرے سامنے تھا۔ شیر کے
ا سے بھی اسی سانپ نے ڈسا تھا اور جب وہ مر گیا تو جنگل
یدڑوں نے اُسے اپنا کھاجا بنایا۔ میں نے شکاریوں کو واپس
لی ہدایت کی اور سورج غروب ہوتے ہوتے ہم بستی میں پہنچ
جومو اور شکاری کی موت کے باعث بستی کی چہل پہل ختم ہو گئی
ب ہی لوگ افسردہ تھے۔

رات کے پچھلے پہر یکایک انسانی چیخوں کی آواز سن کر
آنکھ کھلی اور میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو یوں معلوم ہوا
ی سیاہ رنگ کا جانور پلک جھپکتے میں مکان کا بیرونی حصار پھاند
کر اندر گھس گیا۔ چیخوں کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ ہمت کر کے
نے دروازہ کھولا۔ معلوم ہوا کہ یہ آواز کوارٹر کے عقبی حصے سے
ہی ہے۔

میں نے راجن کو کئی آوازیں دیں، مگر کوئی جواب نہ آیا،
چیخوں سے یہ اندازہ ضرور ہوا کہ کوئی مصیبت زدہ ہے۔ رات
یک تھی اور زیادہ فاصلے کی چیزیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔
نے میز کی دراز میں سے ٹارچ نکالی، پستول ہاتھ میں لیا اور
دھڑکتے دل کے ساتھ باہر نکلی اور دیکھتی بھالتی کوارٹر کے عقبی
میں پہنچی۔ چیخنے کی آوازیں اب کراہنے میں تبدیل ہو گئی تھیں
اس کے بعد یکایک خاموشی چھا گئی۔

مجھے راجن پر سخت غصہ آیا کہ وہ ایسا بے خبر سو رہا ہے۔
کا چھوٹا سا کمرہ مکان کے عقبی حصے کے جنوب میں واقع تھا،
ل چہ میں اُدھر گئی۔ ٹارچ کی روشنی میں کیا دیکھتی ہوں کہ دروازہ
کھلا پڑا ہے اور برآمدے میں خون کے چھوٹے بڑے دھبے کثرت
سے پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر میرے ہوش اُڑ گئے اور اس خون
کو دیکھ کر پہلا خیال، جو میرے دل میں آیا، وہ یہی تھا کہ آدم خور راجن
کو لے گیا۔ اُس وقت مجھ پر جو دہشت طاری ہوئی، اُس کے
تصور سے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

نہایت استقلال سے کام لے کر میں نے ٹارچ کی روشنی
میں راجن کے کمرے اور برآمدے کا معائنہ کیا۔ شیر کے پنجوں کے
نشانات فوراً دکھائی دیے اور میں پستول سختی سے پکڑے ہوئے
اُس تاریک باغیچے کی طرف چلی، جو کوارٹر کے مغربی حصے میں بنایا گیا
تھا۔ یہاں لمبی گیلی گھاس پر جا بجا خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔
چند منٹ بعد میں نے بدنصیب راجن کو باغیچے کے عین وسط
میں پڑے پایا۔ اُس کا چہرہ بری طرح نچا ہوا تھا، کپڑے تار تار
اور خون میں تر تھے۔ میں نے اس کے دل پر ہاتھ رکھا تو معلوم
ہوا کہ وہ زندہ ہے، لیکن دھڑکنے کی رفتار بہت سست ہے۔

رات کے سناٹے میں اس وقت ایک تن تنہا عورت کیا
کر سکتی تھی؟ بدحواسی میں مجھے اُس الارم کا بھی خیال نہ آیا جو ایسے
ہی حملے کے وقت بستی کے لوگوں کو بلانے کے لیے جیمز نے
مکان کے اوپر لگوایا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آدم خور مکان کی باڑ
پھاند کر پہلے وسیع صحن میں کودا اور اُن کمروں کی طرف آیا، جو
ہمارے استعمال میں تھے۔ یہاں دروازے اور کھڑکیاں بند
پا کر وہ جنوبی حصے میں گیا اور راجن کے کمرے کا کھلا دروازہ
دیکھ کر بے دھڑک اندر داخل ہو گیا، لیکن راجن اتنی آسانی سے
اس کے قابو میں آنے والا نہ تھا۔ اُس نے شیر سے باقاعدہ کشتی
کی تھی اور پھر شیر کسی وجہ سے اُسے زخمی کر کے فرار ہو گیا۔

یہ صورت حال نہایت خطرناک تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا
کہ آدم خور کسی وقت بھی اِس علاقے میں گھس کر انسانی جانوں کو

اپنا شکار بنا سکتا ہے اور یہ سوچ کر تو میرا دل لرز گیا کہ اگر میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوتا تو آدم خور یقیناً پہلے مجھی پر وار کرتا۔

شیر کے فرار ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے دونوں کتوں نے اس پر یکایک حملہ کر دیا تھا۔ شیر نے کتوں کو بھی گھائل کیا۔ کتے اگر شیر پر حملہ نہ کرتے تو وہ یقیناً راجن کو اٹھا کر لے جاتا۔ مجھے حیرت تھی کہ کتوں کے بھونکنے کی آوازوں سے بھی میں بیدار نہ ہو سکی۔

بستی کے آدمیوں کو بلانے کے لیے میں نے اسی وقت کئی ہوائی فائر کیے۔ رات کے سناٹے میں فائروں کی آواز دور دور تک پہنچی اور تھوڑی دیر بعد ہی میں نے ان آدمیوں کی آوازیں سنیں، جو دوڑتے ہوئے اسی طرف آ رہے تھے۔

راجن کی حالت لمحہ بہ لمحہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اسے بچانے کے لیے مجھ سے جو ہو سکا، کرتی رہی، لیکن اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ بہت زیادہ خون نکل جانے کے باعث وہ بے ہوشی کے عالم ہی میں سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے چل بسا۔ بستی کے آدمی صبح تک بنگلے کے ارد گرد پہرہ دیتے رہے اور انھوں نے چاروں طرف آگ کے الاؤ بھی روشن کر دیے۔ میں نے سوچا کہ صبح سب سے پہلے جیمز کو تار دوں گی کہ وہ فوراً واپس آ جائے۔

علی الصباح میں نے دیکھا کہ بستی کے تمام مرد و زن بنگلے کے سامنے موجود ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی ان کا بوڑھا سردار آگے بڑھا اور اس نے مجھ سے درخواست کی کہ جب تک "صاحب" واپس نہیں آ جاتے، میں بستی کے اندر رہوں اور جنگل میں نہ جاؤں، کیوں کہ اس کے خیال میں اگر مجھے بھی شیر نے ہڑپ کر لیا تو صاحب اس بستی کے آدمیوں کو سخت سزا دے گا۔

میں نے بوڑھے سردار کے اس خلوص اور نصیحت کا شکریہ ادا کیا اور اسے یقین دلایا کہ میں ایسی کوئی حرکت نہیں کروں گی، جس سے مجھے یا بستی کے لوگوں کو کوئی نقصان پہنچے۔

یوں تو میں نے بستی کے لوگوں سے وعدہ کر لیا تھا کہ میں جنگل میں نہ جاؤں گی، لیکن سچ پوچھیے تو بھائی، جو مو اور پھ راجن کی موت نے میرے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ راجن ہمارے پاس پندرہ سال سے تھا اور اس نے ہماری بڑی خدمت کی تھی اور یہی وجہ تھی کہ آدم خور سے انتقام لینے کی آگ میرے سینے میں بھڑک رہی تھی، مگر کوئی تدبیر ذہن میں نہ آتی تھی۔ شیر نے گزشتہ اڑتالیس گھنٹوں میں تین قیمتی جانوں کو ہلاک کیا تھا اور اس کی دلیری اور مکاری سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اور حملے کرتا۔

میں نے شہر جا کر جیمز کو آنے کا تار دے تو دیا، مگر آد سے دو دو ہاتھ کرنے کا آخری ارادہ بھی پختہ کر لیا۔

گنگاتو کو بھی راجن کے مرنے کا بڑا غم تھا۔ اس روز اپنی جگہ اداس کھڑا رہا اور اس نے کھانے پینے سے انکار راجن ہی وہ آدمی تھا جس نے گنگاتو کو پال پوس کر اتنا بڑا کیا پس اس کی موت پر گنگاتو کو رنج کیوں نہ ہوتا؟ میرے پیر جو جوابی تار مجھے ملا، جس میں درج تھا:

"میں فوراً پہنچ رہا ہوں، گھبرانا مت اور جنگل میں ہرگز نہ جانا۔"

شام کو سورج غروب ہوتے ہی میں نے بنگلے کا چپہ دیکھا۔ ایک کتا، جسے زیادہ زخم آئے تھے، جاں کنی کے عالم چیخ رہا تھا اور دوسرا کسی قدر سہما ہوا اور خوف زدہ نظر آتا میں نے ان دونوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور پھر گنگاتو کو تھپکی دی اور اس کے پاؤں میں بندھی ہوئی زنجیر کھول د ہاتھی نے خوش ہو کر سونڈ سے کئی مرتبہ میرے چہرے کو چھ وہ سمجھ گیا تھا کہ اب اسے پہرے داری کا فرض ادا کرنا ہوگا نے ہاتھی کو باغیچے میں چھوڑ دیا اور خود رائفل سے مسلح ہو کر ا

درخت پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ اس درخت پر ہم نے ایک مستقل [illegible]چان بندھوا رکھی تھی۔ میں نے اپنی ضرورت کی چیزیں اپنے پاس [illegible]تھیں۔

مجھے یقین تھا کہ جھلایا ہوا آدم خور آج رات ضرور ادھر [illegible]گا۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ جنگل کی جانب سے گیدڑوں کی اور بندروں کے چیخنے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ درختوں کے اوپر ہزارہا جھینگا دریں منڈلا رہی تھیں۔ رات کے اس سناٹے میں ذراسی آہٹ بھی درندے کو خبردار کردینے کے لیے کافی ہے، اس لیے شکاری کو نہایت احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے اور وہ اس طرح حرکت کرتا ہے کہ کوئی آواز پیدا نہ ہو۔

مچان پر بے حس وحرکت گھنٹوں بیٹھے رہنا انتہائی تکلیف دہ اور تھکا دینے والا عمل ہے۔ ابتدا میں اس تکلیف کا احساس نہیں ہوتا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک نا ختم ہونے والا عذاب ہم پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ میں نے مچھروں اور چیونٹیوں سے نجات پانے کے لیے اپنے جسم پر ایک بدبودار تیل مل رکھا تھا، لیکن اس کے باوجود ان کے [illegible] نے مجھے بے حد پریشان کیا۔ گشا تو نہایت اطمینان سے نیچے میں کھڑا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنی سونڈ کو حرکت دیتا اور کان [illegible] زور سے ہلاتا۔

دو گھنٹے بعد جب میں نے نیند کا غلبہ محسوس کیا تو تھرماس میں سے چائے نکال کر چند گھونٹ پیے اور تازہ دم ہو گئی۔ دفعتاً میں نے بلندی کی حد پر ایک آہٹ سی سنی۔ میرا دل دھڑکا۔ میں نے رائفل مضبوطی سے تھام لی اور سانس روک کر غور سے ادھر دیکھنے لگی۔ میری آنکھیں اب اندھیرے سے اچھی طرح مانوس ہو چکی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد وہ پراسرار آہٹ پھر سنائی دی، جیسے کوئی جانور دبے پاؤں چل رہا ہو۔ آہستہ آہستہ یہ آہٹ قریب آتی گئی۔ میں نے گردن موڑ کر گشا تو کی طرف دیکھا۔ یقیناً اس نے بھی یہ آہٹ سن لی تھی، کیوں کہ اب وہ سونڈ اور کان نہیں ہلا رہا تھا، بلکہ چپ چاپ کھڑا تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ مچان سے کوئی تیس چالیس گز کے فاصلے پر دو روشن آنکھیں نظر آئیں۔ اندھیرے میں یہ سرخ آنکھیں انگاروں کی مانند دہک رہی تھیں۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ ان آنکھوں کا نشانہ لیا اور لبلبی دبا دی۔ فائر ہوتے ہی ایک چیخ کے ساتھ یہ آنکھیں غائب ہو گئیں۔ رائفل کے دھماکے سے درختوں پر بسیرا کرتے ہوئے پرندے بے تاب ہو کر فضا میں اڑنے لگے اور گشا تو نے بھی چنگھاڑ ماری۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور شیر یا چیتا تھا اور گولی اسے لگی ہے لیکن اس کے گرنے یا تڑپنے کی کوئی آواز نہ آئی۔ اس وقت مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ درخت سے اترتی۔

تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتی ہوں کہ بستی کی جانب سے کچھ لوگ ہاتھوں میں مشعلیں لیے دوڑے آ رہے ہیں۔ جب وہ قریب آ گئے تو میں نے درخت پر سے انہیں آواز دی اور پھر نیچے اتری۔ میں نے انہیں بتایا کہ ابھی ابھی کوئی شیر یا چیتا ادھر آیا تھا، جس پر میں نے گولی چلائی اور وہ یقیناً زخمی ہو گیا ہے۔ جس مقام پر مجھے دو آنکھیں نظر آئی تھیں، وہاں تک جا کر تلاش کی گئی اور مشعلوں کی روشنی کے باوجود [illegible] کیا ہے۔

آخر تھوڑی دیر [illegible] کے بعد میں ان آدمیوں کو ساتھ لے کر [illegible] موجود تھا، لیکن دوسرے [illegible] جس جگہ پر میں نے گولی چلائی تھی [illegible] اس کے پیچھے کچھ جھاڑی ہوئی نکلی [illegible] نشانے پر [illegible]۔

رات کا بقیہ حصہ [illegible] بستی کے آدمی بھی موجود رہے۔

صبح صادق کے وقت پلک جھپکی ہی تھی کہ جنگل کی جانب سے شیر

کے گرجنے کی ہوش رُبا آواز سُنائی دی۔ آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ شیر زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ میں نے فوراً رائفل اُٹھائی، گشاتو پر سوار ہوئی اور تین شکاریوں کو لے کر جنگل کی طرف روانہ ہوگئی۔ شیر سے مقابلہ کرنے کا ایسا جوش مجھ پر طاری تھا کہ بیان سے باہر ہے۔

جنگل میں ابھی بڑا اندھیرا تھا، البتہ صبح کی فرحت بخش ٹھنڈی ہوا کے جھونکے تیزی سے چل رہے تھے۔ گشاتو بھی اپنی سونڈ ہوا میں لہراتا ہوا مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ حبشی شکاری حسبِ معمول بیل گاڑی میں سوار تھے۔ دفعتہً گشاتو چنگھاڑا اور رُک گیا۔ میں نے رائفل سختی سے پکڑ لی اور فائر کرنے کے لیے مستعد ہوگئی۔

جنگل کا یہ حصہ نسبتاً کھلا اور کشادہ تھا۔ طلوع ہونے والے سورج کی روشنی کے باعث دُور کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ میرے بائیں ہاتھ پر دس بارہ فیٹ اونچی خاردار جھاڑیوں کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور شیر یقیناً انہی جھاڑیوں کے اندر چھپا ہوا تھا۔ میں نے گشاتو کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا تو وہ پھر چنگھاڑا اور پیچھے ہٹنے لگا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ مجھے لے کر آگے بڑھنا نہیں چاہتا۔ فوراً ہی میں نے اُسے اشارہ کیا اور اُس نے مجھے سونڈ میں لپیٹ کر نیچے اُتار دیا۔ میں بیل گاڑی کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

مجھے اُتار کر ہاتھی چند لمحے جھومتا رہا، پھر یک لخت سونڈ اُٹھا کر دوڑتا ہوا جھاڑیوں کی طرف گیا۔ اس کے دوڑنے سے زمین ہلنے لگی اور چنگھاڑ سے جنگل بیدار ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے شیر کی بُو پالی ہے۔ دوسری طرف شیر بھی ہولناک آواز میں گرجا اور جھاڑیوں کو چیرتا ہوا باہر نکل آیا۔

ہاتھی کو دیکھ کر شیر نے اپنے پنجوں سے زمین کو کُریدا، پھر بلی کی مانند گھات میں بیٹھ گیا۔ اُس کا پیٹ زمین کو چھونے لگا۔ اب وہ ہاتھی پر حملہ کرنے کے لیے قطعی تیار تھا۔ دیکھتے دیکھتے اُس نے ہاتھی پر پوری قوت سے چھلانگ لگائی اور اُس کی سونڈ پر پنجہ مارا۔ ہاتھی ایک طرف کو جھک گیا اور اُس نے گردن جھٹک کر شیر کو دُور پھینک دیا۔ شیر نے قلابازیاں کھائیں اور اب اُس کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی۔ نہایت ہیبت ناک انداز میں گرجتے ہوئے وہ تڑپا اور دوبارہ ہاتھی کی طرف آیا۔

تینوں شکاری دہشت زدہ ہو کر درختوں پر پناہ لے چکے تھے اور میں بدستور بیل گاڑی کی اوٹ میں کھڑی تھی تاکہ موقع پا کر شیر کو نشانہ بناؤں۔ دونوں بیل بُری طرح کانپ رہے تھے۔ جوں ہی ہاتھی پر لپکا، ہاتھی نے اپنی سونڈ گھمائی اور شیر کو کمر سے پکڑ لیا۔ شیر نے اپنے اگلے دونوں پنجے ہاتھی کی گردن میں گاڑ دیے اور آناً فاناً اسے خون میں نہلا دیا، لیکن ہاتھی نے اس کی کمر نہ چھوڑی اور اتنی قوت سے دبایا کہ شیر کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلنے لگیں۔ اُس نے ہاتھی کی گرفت سے آزاد ہونے کی بڑی کوشش کی، مگر گشاتو نے اُسے زمین پر پٹخ دیا اور پھر اُسے کچلنے کے لیے اپنا پیر اُٹھایا، لیکن شیر بھی بڑا قوی تھا، اُس نے وار خالی دیا اور جھاڑیوں کی طرف بھاگا۔ اُسی لمحے میری رائفل سے بیک وقت دو فائر ہوئے اور شیر وہیں ڈھیر ہوگیا۔

اتنے میں ہاتھی اس کے قریب پہنچ چکا تھا، لیکن میں نے دیکھا کہ وہ زخموں سے نڈھال ہے۔ اُس نے تڑپتے ہوئے شیر کو اپنی سونڈ میں پکڑنے کی آخری کوشش کی اور پھر دھم سے شیر کے اُوپر جا گرا۔ چند منٹ بعد جب میں شکاریوں کے ساتھ اُسے دیکھنے گئی تو معلوم ہوا کہ ہاتھی کے بوجھ سے شیر بُری طرح کچلا گیا ہے۔ میری دونوں گولیاں اس کی گردن میں پیوست تھیں۔

وفادار گشاتو کی سونڈ پر شیر کے پنجوں کے گہرے زخم تھے اور گردن خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ جب میں اُس کے پاس کھڑی تھی تو اُس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کھول

ری جانب حسرت بھری نظروں سے دیکھا، اس کے کان تھرتھرائے اور پھر سارے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اپنے ہاتھی کی یہ حالت دیکھ کر میں رونے لگی اور میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے بھی پانی کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے جان دے دی۔ کاش میں جیمز کی نصیحت مان کر جنگل میں نہ جاتی اور اس طرح اپنے وفادار ہاتھی کو ہلاک ہونے سے بچا لیتی۔"

◆ ◆ ◆ ◆ ◆

ایلسا کا کارنامہ آپ نے پڑھ لیا۔ اب میرا بھی ایک مختصر سا کارنامہ ملاحظہ فرمایئے۔ یہ افریقہ سے نہیں، بلکہ ملایا کے ایک دور افتادہ علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔ میں ان دنوں ربڑ کا کاروبار کرنے والی ایک برطانوی فرم میں ملازم تھا۔ شکار کی لت چونکہ عرصے سے پڑی ہوئی تھی، اس لیے کبھی کبھار یہ شوق بھی پورا ہو جاتا۔ ملایا کے اکثر شیروں کو میں نے ہلاک کیا۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ مشرقی پاکستان میں سندربن کے شیروں کی طرح ملایا میں بھی شیروں کی ایک نسل ایسی ہے جو پیدائشی طور پر آدم خور ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ میرا ایک ملازم جنگل میں پھر رہا تھا کہ اسے ایک جھاڑی کے اندر شیرنی کے دو بچے دکھائی دیے۔ وہ بے وقوف انعام کے لالچ میں ان بچوں کو جان پر کھیل کر اٹھا لایا اور انھیں میرے حوالے کر دیا۔ بچے نہایت کم سن تھے اور ابھی ان کی آنکھیں بھی نہیں کھلی تھیں۔ میں نے انھیں بڑی مشکل سے دودھ وغیرہ پلا کر زندہ رکھا اور تھوڑے دن بعد وہ بلی کے بچوں کی طرح اچھلنے کودنے اور کھیلنے کے قابل ہو گئے اور سارے گھر میں دوڑتے پھرتے۔ انھوں نے بے دریغ گھر کا سامان اور کپڑے نوچنے شروع کر دیے اور اگر انھیں ڈرایا دھمکایا جاتا تو وہ کاٹنے اور پنجے مارنے کی کوشش کرتے۔ یہ صورت حال دیکھ کر میں نے ارادہ کیا کہ ان کو جنگل ہی میں چھوڑ دیا جائے، لیکن میری بیوی نے اس ارادے کی شدت سے مخالفت کی۔ اسے دراصل ان بچوں سے محبت ہو گئی تھی اور یہ اس کے دل بہلانے کا سبب بنے ہوئے تھے۔

چند روز بعد ایسا ہوا کہ شیرنی اپنے ان بچوں کو تلاش کرتی ہوئی ہمارے مکان کی طرف نکل آئی۔ جنگل کے شروع ہی میں ان تمام ملازموں اور مزدوروں کے مکان اور کوارٹر بنے ہوئے تھے، جو یہاں کام کرتے تھے اور کسی درندے نے کبھی ادھر آنے کی جرأت نہ کی تھی، لیکن ایک صبح جب شیرنی کے پنجوں کے نشانات دیکھے گئے تو سب کو تعجب ہوا۔ ایلسا نے بتایا کہ اس نے رات کے آخری حصے میں شیرنی کی آواز بھی سنی تھی۔

میں نے مزید تحقیق کی تو پتہ چلا کہ گزشتہ روز ہمارا ایک دس سالہ گھریلو ملازم لڑکا، جس کا نام ہاشی تھا، شیرنی کے بچوں کے ساتھ کھیلتا ہوا انھیں جنگل میں لے گیا۔ جنگل میں پہنچ کر یہ بچے ادھر ادھر جھاڑیوں میں گھومنے لگے اور پھر یک لخت ایک طرف کو بھاگ نکلے۔ ہاشی انھیں پکڑنے کے لیے دوڑا تو اس نے کچھ فاصلے پر ایک شیرنی کو بیٹھے پایا۔ شیرنی کو دیکھتے ہی یہ خوفزدہ ہو کر الٹے پاؤں بھاگ اٹھا۔ کچھ دور جا کر اس نے منہ میں انگلیاں دے کر سیٹی بجائی۔ شیرنی کے بچے سیٹی کی اس آواز پر چلے ہوتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوڑتے ہوئے ہاشی کے قریب آ گئے۔ ہاشی نے جلدی سے انھیں بغل میں دابا اور گھر چلا آیا۔ اس نے ایک دو مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ شیرنی بھی آہستہ آہستہ چلی آ رہی ہے۔ لڑکا اتنا خوف زدہ تھا کہ اس نے کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں اسے سزا نہ ملے لیکن بعد ازاں اسے سارا قصہ سنانا پڑا۔

میں نے اس صورت حال پر سنجیدگی سے غور کیا اور ایلسا سے کہہ دیا کہ ان بچوں کو اب جنگل میں چھوڑ دینا چاہیے۔

شیرنی نے گھر کا راستہ دیکھ لیا ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ کسی کو نقصان پہنچائے۔ ایلسا نے پھر مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ذرا سی بات کا تبنگڑ بنانا ٹھیک نہیں، ممکن ہے شیرنی کسی اور وجہ سے اِدھر نکل آئی ہو۔ ہم ان بچوں کو جنگل میں چھوڑنے کے بجائے لنڈن کے چڑیا گھر کو بھجوا دیں گے۔

غرض بات آئی گئی ہو گئی، کئی دن گزر گئے۔ شیرنی نے دوبارہ ہمارے مکان کا رُخ نہ کیا۔ میں نے ماشی کو سختی سے ڈانٹا تھا کہ اگر اب وہ بچوں کو جنگل میں لے گیا تو اُسے نوکری سے جواب دے دیا جائے گا۔

بچے روز بروز حد سے زیادہ شریر ہوتے جا رہے تھے گھر کی کوئی شے اُن سے محفوظ نہ تھی۔ جب انھیں زنجیروں سے باندھا جاتا تو شور مچانے لگتے اور زنجیر سے آزاد ہونے کی سرتوڑ کوشش کرتے رہتے۔ میرے جوتوں سے تو انھیں خدا واسطے کا بیر تھا۔ اِدھر جوتا اُتارا، اُدھر انھوں نے جوتوں کو منہ میں دبا کر چبانا شروع کیا۔ نئے جوتوں کو بچانے کے لیے مجبوراً پرانے جوتوں کا انتظام کرنا پڑا تاکہ یہ اُن پر اپنے دانت تیز کرتے رہیں۔

پیر کا دن تھا۔ دوپہر کے وقت، جب کہ میں کھانا کھا رہا تھا، ماشی کا بوڑھا باپ ہمارے ہاں آیا۔ اُس کا گاؤں پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کیسے آنا ہوا تو اُس نے کہا: "کل ماشی گھر نہیں پہنچا، کیا آپ نے اُسے اتوار کی چھٹی نہیں دی؟" یہ سُن کر میرا دل بیٹھ گیا۔ ایلسا نے میری طرف اور میں نے اُس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

واقعہ یہ تھا کہ ملازم لڑکے کو اتوار کے اتوار چھٹی دی جاتی تھی تاکہ وہ اپنے گھر والوں سے مل آئے۔ پیر کی صبح وہ ہمارے پاس واپس آ جاتا تھا، چنانچہ حسبِ معمول اس ہفتے کی شام کو سورج غروب ہونے سے بہت پہلے ہی ایلسا نے ماشی کو گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ پھر کیا بات ہوئی کہ لڑکا گھر نہیں پہنچا؟ معاً میری نظروں کے سامنے وہی شیرنی گھومنے لگی جو اپنے بچوں کی جستجو میں ماشی کے پیچھے پیچھے آئی تھی۔ ممکن ہے نادان لڑکا اُسی شیرنی یا کسی اور درندے کا شکار ہو گیا ہو، حالانکہ یہ بات ذہن میں نہ آتی تھی، کیوں کہ ماشی کے گاؤں کو جانے والی پگڈنڈی کا جنگل سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس پر کثرت سے لوگوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔

لڑکا حد درجہ شیطان اور شریر تھا اور کچھ بعید نہ تھا کہ جنگل میں گھس گیا ہو اور کسی حادثے کا شکار ہو چکا ہو۔ میں نے اُس کے بوڑھے باپ کو تو دلاسا دے کر رخصت کیا اور خود اُس کی تلاش میں جانے کا ارادہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ لڑکا، چوں کہ ہفتے کے روز سرِ شام روانہ ہوا تھا، ممکن ہے وہ جنگل ہی میں سورج غروب ہونے کے بعد کسی محفوظ جگہ چھپ کر سو گیا ہو۔

میں نے اپنے شکاری کتے ٹامی اور اردلی کو ساتھ لیا جنگل کی طرف چل پڑا۔ سینکڑوں مزدور ربڑ کے درختوں پر کام کر رہے تھے اور جنگل میں بڑی چہل پہل تھی۔ میں نے کتے کو ماشی کا ایک پرانا کپڑا سنگھا دیا تھا تاکہ اُس کی بُو سے وہ لڑکے کا سراغ لگا سکے۔ کتا تیزی سے ایک جانب دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ چند منٹ بعد وہ اُسی پگڈنڈی پر ہو لیا جو ماشی کے گاؤں کو جاتی تھی۔ کبھی کبھار وہ رُک کر زمین سونگھتا، اِدھر اُدھر چکر کاٹتا اور پھر آگے روانہ ہو جاتا۔ میں اور میرا اردلی کتے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔

یکایک وہ رُکا اور پھر دیوانہ وار ایک جھاڑی کے نیچے [illegible] فوراً ہی ایک سیاہ دھاری دار ہرن جھاڑی سے نکلا اور چھلانگیں لگاتا ہوا بھاگا۔ مجھ سے صبر نہ ہو سکا، سنبھل کر فائر کیا۔ گولی ہرن کی پچھلی ایک ٹانگ کو زخمی کرتی ہوئی نکل گئی۔ وہ گرا اور تڑپنے لگا۔ کتا وحشیانہ انداز میں اُس کی طرف لپکا اور ہم بھی بے تحاشہ دوڑ [illegible]

ین ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی ہرن اُٹھا اور جھاڑیوں میں گھس یا۔ اب بھلا مجھے کہاں تاب؟ شکار کو یوں ہاتھ سے جاتا دیکھ رتن بدن میں آگ لگ گئی، ہاشی کو بھول گیا اور ہرن کی جستجو ں جھاڑیاں چھاننے لگا۔ کتا بھی اُس کے جسم سے گرا ہوا ون سونگھتا جاتا تھا۔

ہرن کی تلاش میں نہ جانے کتنی دیر جنگل میں پھرتے ہے اور تھک کر کہیں سے کہیں جا نکلے۔ ہوش اس وقت آیا جب سورج اپنی آخری کرنیں زمین پر ڈال کر رخصت ہونے کی تیاری کر رہا تھا اور جنگلی پرندوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ یتی تھی۔ سر توڑ کوشش کے باوجود زخمی ہرن کا سُراغ نہ ملا، البتہ ند گیدڑوں کو ایک جگہ کسی جانور کی لاش پر دانت تیز کرتے پایا۔ ہمیں دیکھتے ہی گیدڑ بھاگ نکلے۔ یکایک اردلی چلایا:

"جناب، وہ دیکھیے کیا ہے؟"

میں نے دیکھا تو یوں محسوس ہوا، جیسے قلب کی حرکت ب لخت رک گئی ہو، کیونکہ گیدڑ جس "جانور" کو جھنجھوڑ رہے تھے وہ ہاشی کی لاش تھی۔ میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ معائنہ کرنے سے پتہ چلا کہ یہ کارستانی شیرنی کی ہے۔ لاش میں ب کھا ہی گیا تھا، بڑا حصہ شیرنی ہڑپ کر چکی تھی اور بقیہ گیدڑوں کی ضیافت کے لیے کام آ رہا تھا۔ اس لڑکے کی لاش دیکھ کر اتنا صدمہ مجھے ہوا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ غم و غصے کے باعث میری حالت غیر ہو گئی اور میں نے قسم کھائی کہ جب تک اس شیرنی کو ہلاک نہ کر لوں گا، جس نے اس معصوم بچے کو کھایا ہے، اس وقت تک گھر نہ جاؤں گا۔

میں نے اردلی سے کہا کہ وہ گھر چلا جائے اور املیا کو حالات سے آگاہ کر دے، مگر وہ مجھے تنہا چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ ڈر کے مارے وہ اکیلا جاتے ہوئے گھبراتا ہے۔ لاش کے اردگرد نرم زمین پر شیرنی کے پنجوں کے نشانات واضح تھے۔ کچھ فاصلے پر لڑکے کی چھوٹی سی لاٹھی بھی پڑی مل گئی۔ اس لاٹھی کے سرے پر شیرنی کے بہت سے بال بھی چپکے ہوئے نظر آتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہادر لڑکے نے اس لاٹھی سے پہلے شیرنی کا مقابلہ کیا اور اس کے سر پر ضربیں لگائی تھیں۔

سورج غروب ہو گیا اور جنگل پر تاریکی مسلط ہو گئی۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا، کچھ فاصلے پر گھاس کا ایک قطعہ تھا، جس کے کنارے پر چند اونچے درخت کھڑے تھے۔ گھاس نہایت گھنی اور لمبی تھی اور اس میں شیرنی آسانی سے چھپ سکتی تھی۔

میں نے اردلی کی مدد سے لاش کے بچے کھچے ٹکڑے اُٹھائے اور اس گھاس میں لے جا کر رکھ دیے۔ اس کے بعد ایک درخت پر چڑھ کر شیرنی کا انتظار کرنے کی ٹھانی۔ اردلی کے پاس اگرچہ بندوق موجود تھی، لیکن وہ بے حد خوف زدہ تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہر طرف دیکھتا۔ ایک مرتبہ جب میں نے اس کے کندھے کو چھوا تو دہشت سے اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ سمجھا کہ شاید شیرنی نے اُس پر حملہ کر دیا ہے۔

رات نہایت تاریک اور سرد تھی۔ ایک گھنٹے بعد یہ مصیبت نازل ہوئی کہ مغرب کی جانب سے نہایت زبردست طوفان کی آمد آمد ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر بادل گرجے، بجلی کڑکنے لگی اور پھر ایسی موسلا دھار بارش شروع ہوئی کہ خدا کی پناہ — ہم دونوں بندروں کی طرح درخت کی شاخوں اور پتوں میں چھپے بھیگتے رہے۔ دفعتہً بجلی بڑے زور سے کڑکی اور تڑاخ سے وہ شاخ ٹوٹ گئی جس پر ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ زمین سے اس شاخ کی اونچائی تیس فیٹ سے کم نہ تھی اور خدا نے یوں بچایا کہ ہم لمبی گھاس میں جا گرے اور کچھ زیادہ چوٹ نہ آئی۔ میں نے جلدی سے اردلی کو سنبھالا۔ اس کے

ہوش و حواس گم تھے اور وہ دبی دبی آواز میں چیخ رہا تھا۔

درخت پر دوبارہ چڑھنے کی ہمت نہ تھی، مجبوراً ہم گھاس میں دُبک کر بیٹھ رہے۔ ہمارے جسم اور کپڑے پانی میں تر اور کیچڑ میں لت پت تھے اور جب بجلی کوندتی تو ہم ایک دوسرے کو دیکھتے۔ سردی کے باعث ہمارے بدن کانپ رہے تھے اور تھوڑی دیر بعد اردلی صاحب کے تو باقاعدہ دانت بجنے لگے۔

وقت کا کچھ اندازہ نہ تھا، کیوں کہ جب میں درخت سے گرا تو کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی ٹوٹ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اردلی نے منت سماجت شروع کی کہ واپس چلنا چاہیے۔ اُس کا کہنا یہ تھا کہ شیرنی اسی جنگل میں رہے گی اور اُسے پھر کسی وقت مارا جا سکتا ہے، لیکن میں نے اُسے ڈانٹ دیا اور کہا،

"اگر زیادہ ضد کرو گے تو تمہیں یہیں شوٹ کر دوں گا، جب میں نے تم سے کہا تھا کہ گھر چلے جاؤ تو اُس وقت تم نے جانے سے انکار کیوں کیا تھا؟"

اردلی رونے لگا اور دیر تک روتا رہا۔ میں اُس کے سر پہ دو ہتھڑ مارنے ہی والا تھا کہ کُتا، جو اتنی دیر نہ جانے کہاں چھپا رہا، نہایت زور سے بھونکا۔ میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ یکایک عقب سے شیرنی کے غرانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو جان ہی نکل گئی۔ شیرنی مجھ سے صرف دس قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی اور اس کی آنکھیں مشعل کی مانند روشن تھیں۔ شیرنی نے جھلا کر کُتے پر حملہ کیا اور ایک ہی وار میں اُس کی انتڑیاں نکال کر پھینک دیں اور غراتی ہوئی ایک جانب چلی گئی۔ اردلی تنے میں غش کھا چکا تھا اور یہ بہت اچھا ہوا، ورنہ وہ کم بخت چیخ چیخ کر شیرنی کو خبردار کر دیتا۔ وفادار کُتے نے اپنی جان قربان کر کے ہمیں بچا لیا۔ ورنہ شیرنی بے خبری میں ضرور ہم پر آن پڑتی۔

میں نے چند لمحے انتظار کیا۔ شیرنی کی کوئی آواز سنائی نہ دی۔ اردلی کو خدا کے حوالے کر کے میں دبے پاؤں اُسی طرف بڑھا، جس طرف شیرنی کو جاتے دیکھا تھا۔ یہ موقع ایسا نازک اور خطرناک تھا کہ معمولی سی بے احتیاطی اور غفلت مجھے شیرنی کا نوالہ بنا سکتی تھی۔ غالباً وہ خود بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج سے خوف زدہ تھی اور اسی لیے اُس نے ہماری جانب توجہ نہ کی۔ گھاس نہایت گھنی اور لمبی تھی اور اس کے پتّے تلوار کی دھار کی مانند تیز تھے۔ اب میں گھاس کے اندر ہاتھوں اور پیروں کے بل چل رہا تھا۔ تیز ہوا جب اس میں سے گزرتی تو نہایت ڈراؤنی آوازیں سنائی دیتیں اور ایسا معلوم ہوتا، جیسے شیرنی میرے پیچھے کھڑی غرا رہی ہے۔

خدا خدا کر کے بارش تھمی۔ تھوڑی دیر بعد مطلع صاف ہو گیا اور پچھلے پہر کے چاند نے اپنی صورت دکھائی۔ یقین کیجیے کہ اگر چاند چند منٹ بعد نکلتا تو یہ قصہ سنانے کے لیے میرا وجود دُنیا میں نہ ہوتا، کیوں کہ روشنی پھیلتے ہی گھاس میں چھپی ہوئی بھوکی شیرنی، جو یقیناً ہاتھی کی لاش پر آئی تھی، ایک خوف ناک گرج کے ساتھ اُچھل کر میری جانب آئی۔ میں نے رائفل تان کر اندھا دھند دو فائر کیے۔ گولیاں شیرنی کی کھوپڑی میں اُتر گئیں، لیکن اتنی ہی دیر میں وہ چھلانگ لگا کر میرے سر پر آ چکی تھی۔ مجھے کچھ اور نہ سوجھا تو رائفل کا کُندا پوری قوت سے اُس کے سر پر دے مارا۔ شیرنی وہیں ڈھیر ہو گئی۔

اپنے حواس درست کرنے کے بعد میں نے اردلی کی خبر لی تو اُسے درخت کے تنے سے چمٹے ہوئے پایا۔ اس کی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ ہم نے ایک مضبوط شاخ پر سات فیٹ لمبی اور تقریباً ساڑھے تین من وزنی شیرنی کی لاش باندھی اور جب بستی کی طرف چلے، تو مشرق سے سپیدۂ سحر نمودار ہو کر میری کامیابی پر مسکرا مسکرا کر مبارک باد پیش کر رہا تھا اور میں خوش تھا کہ خدا نے میری قسم کی لاج رکھ لی۔

زعفران کے پھول

خواجہ احمد عباس



آؤ مسافر! یہاں اس چنار کے سائے میں بیٹھ جاؤ، میں بھی پانی پلاتی ہوں...... وہ نیلی لمبی سی موٹر ہے نا تمہاری.. ....پنکچر ہو گیا ہے...... کوئی بات نہیں اندھیرا ہونے سے پہلے سری نگر پہنچ جاؤ گے...... اب پیسوں کی بات ہی ہے .... نہیں بیٹا! مجھے پانی کی قیمت نہیں چاہیے اور پھر پیسے لے کر کروں گی بھی کیا۔ میرا ہے ہی کون...... اکیلی جان ہوں، ذیلدار کے کھیت میں کام کرتی ہوں۔ چشمے سے پانی بھر لاتی ہوں، دھان کوٹ دیتی ہوں۔ اللہ کا شکر ہے مٹھی بھر چاول تو مل ہی جاتا ہے۔ پانچ اوپر ساٹھ عمر ہونے کو آئی ہے اور چاہیے ہی کیا ایک بڑھیا کو۔ آج مری کل دوسرا دن...... تم بھی کہتے ہوگے کس کنجوس سے پالا پڑ گیا ہے......

کیا کہا تم نے بیٹا؟...... نہیں نہیں گل لالہ کا نہیں۔ یہ زعفران کا کھیت ہے۔ ٹھیک کہتے ہو۔ زعفران کے پھول سچ مچ کاسنی ہی ہوتے ہیں۔ ابھی آگے جاؤ گے تو دوسرے کھیتوں میں کاسنی پھول ہی پاؤ گے۔

پر یہاں اس سال زعفران کے سرخ پھول ہی کھلے ہیں...... اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ خدا کی قدرت ہے بیٹا، پر تم میدانوں کے رہنے والے آج کل کے نوجوان خدا اور اس کے کرشموں کو کب مانتے ہو۔ ہم کشمیریوں کو وہمی اور بیوقوف سمجھتے ہو کہ ہم ایسی باتوں میں اعتقاد رکھتے ہیں۔

اب ان پھولوں کی پوری کہانی سن کر کیا کرو گے؟ ابھی تمہاری موٹر ٹھیک ہو جائے گی اور تم چلے جاؤ گے اور کہانی ادھوری رہ جائے گی...... موٹریں تو اس سڑک پر سے گزرتی ہی رہتی ہیں۔ بیٹا پل دو پل کو ٹھہرتی بھی ہیں تو پھر دھوئیں کے بادل اڑاتی چلی جاتی ہیں۔ پر یہ زعفران کی کھیتی یونہی کھڑی رہے گی۔ یہاں تک کہ پھول چننے کا وقت آ جائے گا اور یہ لال لال لہو کی بوندوں جیسے شگوفے سکھا کر دساور کو بھیج دیے جائیں گے اور نہ جانے ان کی خوشبو کہاں کہاں اور کس کس کے دسترخوان پر مہکے گی اور تمہاری طرح کتنے ہی آدمی سوال کریں گے۔ اس زعفران کا رنگ لہو کی طرح سرخ کیوں ہے؟...... پر کوئی نہ بتا پائے گا کیوں کہ اس کی وجہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں۔

تم مجھے پاگل سمجھتے ہو نا...... دیوانی بڑھیا ہو نہ جانے کیا کیا بک رہی ہے...... ہے نا!... پھر بھی اس لال زعفران کا بھید جاننا چاہتے ہو؟...... ابھی تمہاری موٹر کے ٹھیک ہونے میں دیر ہے اور تم وقت کو ایک پگلی کی بڑبڑ سن کر ہی کاٹنا چاہتے ہو؟.... خیر جو بھی ہو سننا چاہتے ہو تو سنو......

ہاں تو اس کھیت میں لال زعفران کے پھول تو اسی سال لگے ہیں۔ پہلے یہاں بھی کاسنی پھول ہی لگا کرتے تھے۔ ساری وادی پر بہار آجاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کوئی نئی نویلی دلہن زعفرانی دوشالہ اوڑھے لیٹی ہے اور خوشبو سے یہ سارا علاقہ مہک اٹھتا۔ سڑک پر موٹریں جو گزرتیں ان کی دھول کے بادلوں میں بھی خوشبو پھیل جاتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ زمین سے آسمان تک ہر چیز زعفران میں بسی ہوتی ہے۔ تمہاری طرح ایک اور مسافر بھی اس کھیت کے پھولوں کو دیکھنے ٹھہر گیا تھا...... کئی برس کی بات ہے۔ کوئی بہت ہی سیدھا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بے چارہ کھیت میں جا کر پھولوں کے بیچوں بیچ میں کھڑا ہو گیا اور لگا نتھنے پھلا پھلا کر سانس لینے ناک سے۔ جیسے پھولوں کو سونگھ رہا ہو۔ بلکہ ان کی خوشبو کو پی رہا ہو۔ پھر آپ سے آپ ہی کہنے لگا

"عجیب بات ہے کوئی بھی نہیں آئی؟"

میں نے پوچھا

"کون؟ آخر کس کو کھوجتے ہو؟"

تو جواب ملا

ہنسی نہیں آئی۔ عجیب بات ہے حالانکہ کتابوں میں تو...

تو بیٹا تب پتا چلا کہ وہ بے چارا کتابوں میں پڑھ کر آیا تھا کہ اگر زعفران کے کھیت میں کھڑے ہو کر اس کی خوشبو سونگھو تو آپ ہی آپ ہنسی آنے لگتی ہے۔ اتنے میں خدا کا کرنا کیا ہوا کہ سر پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے زعفرانی آ گئی۔ میں نے تو اسے یہ بات بتائی تو کھل کھلا کر ہنسنے لگی اور وہ بھی پہلے تو کھسیانا ہو گیا مگر جب اس نے دیکھا کہ زعفرانی کے ہنستے ہنستے برے حال ہو رہے ہیں تو وہ بھی لگا ہنسنے۔ دونوں کو ہنستے دیکھ کر مجھے بھی ہنسی آ گئی اور بعد میں ہنسی کہنے لگا کہ دیکھو کتابوں کا لکھا پورا ہوا۔ کیوں کہ زعفران کے کھیت میں ہم تین ہی کھڑے تھے اور تینوں کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔

میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

بیٹا بڑھاپے میں دماغ قابو میں نہیں رہتا۔ بات کرتے کرتے بھٹک جاتی ہوں...... ہاں تو زعفرانی...... کیا کہا...... زعفرانی کون؟ ابھی تو بتا چکی ہوں کہ زعفرانی میری بیٹی تھی۔ نہیں بتایا تھا؟...... بھول گئی ہوں گی...... تو دیکھ لو یادوں کا یہ حال ہے بیٹا...... ہاں تو اس کا نام تو اصل میں نوراں تھا مگر گاؤں میں سب اسے زعفرانی کہہ کر پکارتے تھے۔ بات یہ ہے کہ بچپن ہی سے اس کی رنگت کچھ پیلی پیلی سی تھی۔ لڑکپن میں بچوں بچیوں کے ساتھ دھمال مچایا کرتی تھی اور زعفرانی کہہ کر چھیڑا کرتے اور جتنا ہی وہ چڑتی اتنا ہی وہ اور شور مچاتے، زعفرانی زعفرانی۔

تم جانو بچے کسی کی مانتے تھوڑا ہی ہیں...... ہاں تو جب وہ جوان ہوئی تو گاؤں کے لڑکے کہنے لگے کہ نوراں جیسی خوبصورت لڑکی تو ہمارے ہاں ایک بھی نہیں۔ اس کی رنگت تو زعفران کے پھولوں کی طرح ہے۔ اس کی آنکھیں تو کھلے ہوئے کنول ہیں اور نہ جانے کیا کیا اوندھی سیدھی باتیں۔ مجھے تو اس میں کوئی خوبصورتی نظر آتی نہیں تھی۔ ایک تو دبلی تھی جیسے چشمے کے کنارے اُگے ہوئے بید مجنوں۔ رنگت بالکل پیلی جیسے بیمار ہو۔

دیدے پھٹے ہوئے اوپر سے یہ کہ تمیز نام کو نہیں۔ نہ چھوٹے کا خیال نہ بڑے کا۔ بس ہر وقت دھما چوکڑی سے مطلب۔ میں تو ذرا منہ نہیں لگاتی تھی۔ پر تین بھائیوں میں ایک بہن تھی۔ وہ بھی سب سے چھوٹی۔ باپ اور دونوں بڑے بھائیوں نے لاڈ پیار میں بگاڑ رکھا تھا۔ میں سوچتی ایسی لڑکی سے کون شادی کرے گا۔ پر وہاں تو جسے دیکھو وہ زعفرانی ہی سے بیاہ کرنے پر تلا ہوا تھا...... تم لڑکوں کی پسند کا بھی کچھ ٹھیک نہیں بیٹا۔

ہاں تو پیغام چاروں طرف سے آ رہے تھے، یہاں تک کہ ذیلدار نے اپنے لڑکے کا پیغام دے دیا جو شہر کے اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ بھلا ایک معمولی کسان کی بیٹی کو اس سے اچھا کون سا بر مل سکتا تھا؟... میں نے سوچا کہ زعفرانی کی قسمت کھل گئی...... پر خدا کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس سال جاڑے کے موسم میں نمونیہ کا بخار ایسا چلا کہ گھر والا اللہ کو پیارا ہو گیا۔ خدا اسے جنت نصیب کرے! اس کا مرنا تھا کہ ہمارے گھر

آفتوں پر آفتیں آنی شروع ہوگئیں۔ مرنے والے نے مہاجن سے قرض لے رکھا تھا۔ اس میں زمین کی قرقی ہوگئی۔ اس پر بھی میری ہمت نہ ٹوٹی۔ تین بیٹے تھے نا۔ میں نے سوچا روپے، زمین سے کیا ہوتا ہے۔ میری اصل پونجی تو میری اولاد ہے۔ ہاں ایک زعفرانی کی طرف سے فکر ضرور تھی کہ غریب اور یتیم بچی کو کون بیاہے گا۔

سینکڑوں برسوں سے ہم اس گاؤں میں رہتے چلے آرہے ہیں۔ کبھی فصل اچھی ہوتی ہے کبھی بری۔ کبھی اتنا پانی برستا ہے کہ کھیتیاں بہہ جاتی ہیں۔ کبھی دھوپ میں جل جاتی ہیں، کبھی برف میں تباہ ہو جاتی ہیں۔ کبھی ہم اپنی زمین بوتے ہیں کبھی دوسرے کی۔ قسمت کی اونچ نیچ تو انسان کے ساتھ لگی ہی رہتی ہے۔ اور بیٹا کبھی کبھی راجہ کے افسر بھی ظلم کرتے رہتے ہیں۔ راجہ پرجا کا کیا مقابلہ؟ صبر شکر سے زندگی کسی نہ کسی طرح بسر ہوتی جاتی ہے۔ مگر بچے کہتے ہیں کہ یہ کلجگ ہے کلجگ اس میں جو نہ ہو تھوڑا ہے...... کئی برس کی بات ہے ابھی گھروالا زندہ ہی تھا ایک دن میں دھان کوٹ رہی تھی کہ میرا بیٹا نورو چلاتا ہوا آیا۔

ماں ماں! شیر کشمیر آئے ہیں۔ شیر کشمیر

بس اتنا کہہ کر یہ جا وہ جا۔ میں چلاتی ہی رہ گئی کہ ارے اگر شیر آیا ہے تو ذیلدار صاحب کو بول جا کے بندوق لے کے آویں...... تھوڑی ہی دیر میں کیا دیکھتی ہوں کہ سارے ہی گاؤں والے...... کیا مرد اور کیا عورت اور کیا بچے بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا شیر کو پکڑ لیا ہوگا تبھی تو عورتیں بچے بھی نڈر ہو کر جا رہے ہیں۔ چلو میں بھی تماشا دیکھوں۔

وہ نقشہ آج تک یاد ہے۔ مجھے گاؤں کے اس سرے پر...... ارے وہ دیکھو ان درختوں کے پیچھے...... ایک اسکول ہے...... اب تو مڈل کامیاب ہو گیا ہے پر جب چار جماعتوں ہی کی پڑھائی ہوتی تھی...... ہاں تو کیا دیکھتی ہوں کہ اسی اسکول کے سامنے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوتے ہیں اور سامنے نہ شیر تھا نہ چیتا۔ ایک لمبا سا گورا سا آدمی چبوترہ پر کھڑا زور زور سے کچھ کہہ رہا تھا۔ لو بھی پتا

شیر کشمیر...... میں نے کہا تو خواہ مخواہ ہی ڈرا دیا۔ شیر تو شیر یہ کوئی معمولی جیسا سرکاری افسر بھی نہیں ہے۔ بھلا افسر کہیں گاڑھے کھدر کے موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے ہیں۔ جس طرح وہ زور زور سے تقریر کر رہا تھا اب بے میں سمجھی کہ چائے بیچنے والا ہوگا۔ اب تھوڑی دیر میں کالا نوار کھ کے بجونپو والا باجا بجائے گا۔ پھر مفت چائے سب کو ملے گی اسی انتظار میں میں بھی وہاں جا کر کھڑی ہوگئی پر وہ تو کشمیری میں بول رہا تھا اور اگر چائے والا تھا تو اس کی چائے تو بہت ہی گرما گرم اور خطرناک تھی۔ میں نے دو چار بول ہی سنے تھے کہ ڈر گئی یا اللہ اب ہمارے گاؤں پر کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور آئے گی وہ باتیں ہی ایسی کر رہا تھا کہ دل دہل جاتے۔ ریاست کے اصل مالک راجہ اور اس کے افسر نہیں بلکہ ہم کسان ہیں ہم پر ظلم ہو رہا ہے۔ سب کو مل کر اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے۔ آپس میں ایک ہو جانا چاہیے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو پڑھنا چاہیے۔ پڑھ لکھ کر یہ کشمیری قوم کے لیڈر بنیں گے اور نہ جانے کیا کیا۔ میں نے تو پوری بات سنی بھی نہیں۔ زعفرانی منہ پھاڑے ایک کونے میں کھڑی تھی۔

میں اس کا ہاتھ گھسیٹتی ہوئی چل کر گھر جا کر اس کے باپ سے ایسا بٹوانوں کی کہ پھر کبھی ہمت نہ پڑے ایسی خطرناک جگہ قدم دھرنے کی۔ پر بچے گئے جہاں بڑے بوڑھے بیٹھے ہوتے تھے وہاں کیا دیکھتی ہوں کہ وہ خود بھی وہاں بیٹھا بڑے غور سے سن رہا ہے۔ جل ہی تو گئی میں تو جانتے ہی ہو تالاب کے بیچ میں ایک پتھر پھینک دو تو سارے پانی میں ہلچل مچ جاتی ہے تو بیٹا یہ شیر کشمیر بھی ایک ایسا ہی پتھر تھا جس نے ہمارے گاؤں کے ٹھہرے ہوئے پانی کو ہلا دیا۔ وہ دن اور آج کا دن، آرام اور چین صبح اور شانتی کا نام نہیں رہا۔ جس کو دیکھو بے چین، جس کو دیکھو اس کی زبان پر شکایت، ہر ایک اپنی زندگی سے نالاں ہے اس کو بدلنے پر تلا ہوا ہے۔ میں کہتی ارے تمہارے باپ دادا نے بھی اپنی عمریں انہی راجوں مہاراجوں کے افسروں کے ظلم سہتے سہتے دکھی سکھی کھا کر صبر شکر سے کاٹ دیں۔ تم میں کون سرخاب کے پر لگے ہیں کہ ساری دنیا کو بدلنے پر تلے ہو...... پر میری کون سنتا ہے بیٹا......

وہ تو شیر کشمیر نے جادو ہی ایسا کیا تھا...... تم میری باتوں سے اکتا

گئے ہونا؟ وہ زعفران کے لال پھولوں کا بھید؟ ہاں ہاں بیٹا اسی کی بات تو کر رہی ہوں۔ تم بھی کہتے ہوگے یہ کہاں کا جھگڑا لے بیٹھی پر بات یہ ہے کہ نہ تو گاؤں کے شہرے ہوتے شانت ملاؤں میں شیر کشمیر کی تقریر کا وہ پتھر گرتا اور نہ یہ زعفران کے پھول لال ہوتے .... یہ کیسے؟ یہی تو بتا رہی ہوں پر تم بیچ میں ٹوکتے ہی جاتے ہو۔

ہمارے گاؤں میں اس کو آتے ہوتے دو چار مہینے ہوئے ہوں گے کہ خبر آئی کہ شیر کشمیر کو راجہ نے پکڑ لیا اور جیل میں بند کر دیا۔ میں نے کہا چلو اچھا ہوا اب سب اس کی سکھائی پڑھائی کی باتیں بھول جائیں گے اور گاؤں میں صبر شکر کے دن پھر لوٹ آئیں گے۔ پر جی ان کی گرفتاری پر اور بھی اس کا چرچا ہونے لگا۔ جس کو دیکھو غصے میں بھرا ہوا ہے کہ ہمارے شیر کشمیر کو پکڑ لیا۔ اب اس سرکار کی خیر نہیں اور ایسی باتیں کرنے والوں میں میرے لڑکے سب سے آگے آگے۔ تھوڑے دنوں میں سنا کہ چھوٹ گیا۔ میں نے سوچا یہ بھی اچھا ہوا نہیں تو یہ لڑکے سرکار کو برا بھلا کہتے رہتے اور ذیلدار یا کوئی سرکاری افسر سن لیتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔

جب تک باپ زندہ رہا بیٹے کچھ قابو میں رہے۔ اس کا مرنا تھا کہ جس کا جدھر منہ اٹھا ادھر چل دیا۔ زمین تو جاتی ہی رہی تھی۔ بڑا غلام نبی کہنے لگا میں دوسرے کی زمین پر مزدوری نہیں کروں گا اس سے تو بہتر ہے سری نگر گلمرگ میں مسافروں کا سامان اٹھا کر لے جانے کا کام کروں۔ دو تین روپے روز کما سکتا ہوں۔ میں نے لاکھ سر پٹخا مگر وہ ایک نہ مانا۔ جب گیا ہے تو سارے گاؤں کے لڑکوں میں سب سے زیادہ چوڑا چکلا سینہ تھا۔ اس کے چھ مہینہ بعد دو چار دن کو جو آیا تو پہچاننا مشکل ہو گیا۔ رنگت زعفرانی سے بھی زیادہ پیلی، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ماتھے پر گھاؤ جیسا گہرا گڑھا جہاں بوجھ سنبھالنے کے لیے مزدور پٹا باندھتے ہیں۔ اور رات بھر کھانستا۔ کبھی کبھی تو اتنا کہ ہوش نہ رہتا۔ میں نے کہا یہ کیا حالت ہو گئی تیری؟ کیا بیمار ہے؟ بولا نہیں ماں۔ بوجھ اٹھانے والوں کے ماتھوں پر ایسا گڑھا تو پڑا رہتا ہے۔ رہی کھانسی تو وہ اس دن تنگ مرگ سے ایک صاحب کا سامان گلمرگ لے جا رہا تھا۔ بیچ میں بارش آ گئی بھیگنے سے زکام کھانسی ہو گئی۔ چار دن بعد جب وہ تنگ مرگ گیا تو مجھلا نور دین بھی ساتھ ہو لیا۔ کہنے لگا ماں باپ کا لحاظ ہی نہیں رہا تو یہاں رہنے سے کیا فائدہ۔ نور دین کو گئے ہوتے تین چار مہینے ہوئے ہوں گے کہ ذیلدار نے شہر سے آکر کہا، غلام نبی کی ماں اب تمہاری خیر نہیں ہے۔ تمہارا مجھلا بیٹا نور دین شیخ عبداللہ کی پارٹی میں شامل ہو گیا۔ دن کو کشتی چلاتا ہے۔ رات کو مزدوروں کے جلسے میں جا کر تقریریں کرتا ہے۔ میں نے کہا بی مینڈکی کو بھی زکام ہوا۔ وہ شیر کشمیر تو سنا پہلے ماسٹر تھا پہلے اس کسانوں کے چھوکرے کو دیکھو یہ بھی چلا ہے لیڈری کرنے۔ پر میں نے سب سے کہہ دیا کہ آج سے میرے سامنے اس کا نام نہ لینا نہ وہ میرا بیٹا نہ میں اس کی ماں ......

زعفرانی تو میں اس کا ذکر کرنا ہی بھول گئی تو بیٹا اب ہمارے گھر میں رہ ہی گیا تھا کون؟ بس میں زعفرانی اور سب سے چھوٹا لڑکا غفورا زعفرانی اب بیس برس کی بن بیاہی بیٹھی تھی۔ گھر میں پیسے ہوں تو اس کی شادی کی بات چیت کروں اور یہاں اول تو آمدنی ہی صفر تھی ادھر سنا سمندر پار ولایت میں لڑائی شروع ہو گئی مہنگائی کا یہ عالم ہوا کہ بس کچھ مت پوچھو۔ میں اور زعفرانی دونوں کام کرتے تھے۔ کبھی کسی کے کھیت پر کبھی جنگل سے لکڑیاں چن لاتے کبھی پانی بھرتے، کبھی اون کاتتے تب جا کے دو وقت چولہا جلتا۔ میں نے کہا غفورا دس برس کا ہو گیا۔ اس کو بھی کام پر لگا دیں۔ پر زعفرانی بولی نہیں ماں ہم تو غفورے کو مدرسہ پڑھنے بھیجیں گے۔ میں نے کہا پاگل ہو گئی ہے پر وہ ایک نہ مانی۔ مجھ سے پوچھے بغیر اگلے دن سویرے خود لے جا مدرسہ میں داخل کروا آئی جوان برابر کی لڑکی۔ اب میں اسے کہوں بھی تو کیا کہوں۔ پھر اس کے بیاہ نہ ہونے کا بھی دکھ تھا۔ اس واسطے میں چپ ہی ہو گئی۔ مگر میرا ماتھا ٹھنکا آج اس گھر کا پہلا لڑکا مدرسہ گیا ہے۔ اب نہ جانے کون سی مصیبت آئے گی ...... پر بیٹا اس لونڈیا پر تو پڑھائی کا بھوت سوار تھا۔ دن رات بھائی کے پیچھے پڑی رہتی ...... مدرسہ سے آتا تو کہتی گھر پر بیٹھ کر پڑھو حساب کا سوال پوچھنے ماسٹر کے ہاں جایا کر۔ یہ کرو، وہ کرو۔ اس کا بس نہ چلتا کہ کتابیں گھول کر غفورا کو پلا دے ...... جس گھر میں بیری کا پیڑ ہو تو لب

بیٹا وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں..... میں اکیس برس کی لڑکی پھر شکل و صورت میں نُور کا بچہ نہیں تھی تو کانی بھینگی چیچک داغ بھی نہیں تھی۔ اور تم جانو آج کل کے لونڈے شہر جا کر سینما بائیسکوپ تماج رنگ نہ جانے کیا کیا دیکھ کر کتنے آوارہ ہوگئے ہیں۔ ایک دن زعفرانی لکڑیاں چننے گئی تھی کیا دیکھتی ہوں خالی ہاتھ واپس چلی آرہی ہے زار وقطار روتے ہوئے۔ میں نے پوچھا کیا ہوا۔ تو کچھ جواب نہیں دیا۔ روئے چلی جارہی ہے۔ اری کم بخت کچھ کہے گی بھی، کیا ہوا کسی نے مارا، گالی دی، چوٹ لگ گئی۔ آخر کیا ہوا؟ اس کا جواب سن کر میں تو دنگ رہ گئی۔ بیٹا بات ہی اس نے ایسی کہی جو کسی ماں نے اپنی بیٹی کی زبان سے کبھی نہیں سنی ہوگی.. کہنے لگی...

ماں میرا بیاہ کر دو۔ اور پھر رونے لگی۔ دس دفعہ پوچھا تب یہ بات کھلی کہ لکڑیاں چن رہی تھی کہ ذیلدار کا لڑکا جو شہر سے آیا ہوا ہے ادھر آن نکلا اور لڑکی کو اکیلا دیکھ کر لگا اول فول بکنے۔ جب زعفرانی نے جھڑکا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر ارادے سے اپنی طرف گھسیٹنے لگا بڑی مصیبت سے ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی آئی تھی بے چاری۔ مگر اس بدمعاش کی ہول دل میں تھی...... میں ابھی تک پتے کی طرح تھر تھر کانپ رہی تھی اور رو رہی تھی اور جب ذرا ہچکیاں رکیں تو یہی کہتی!

ماں میرا بیاہ کر دو۔ نہیں تو ایک دن میری عزت مٹی میں مل جائے گی.......

● اب تم ہی بولو بیٹا غریب عورت کرے تو کیا کرے۔ جب دمڑی پاس نہ ہو تو کس برتے پر لڑکی کا بیاہ رچائے...... پھر بھی میں نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی کہ کوئی غریب مگر طبیعت کا شریف آدمی مل جائے جو زعفرانی کو بیاہ لے تو یہ فکر دور ہو جائے مگر پچاس ساٹھ روپے تو تب بھی چاہئیں۔ زمین زیور یہاں تک کہ بیل اور زعفرانی کے کانوں کے بالے بھی بک چکے تھے۔ اب تو کچھ بھی نہیں تھا جس کے سہارے قرض ہی مل جاتا۔ اسی ادھیڑبن میں لگی ہوئی تھی کہ ایک آدمی ایک دن آیا۔ شکل و صورت سے بے چارہ قلی معلوم ہوتا تھا۔ وہی ماتھے پر پٹے کا نشان مگر تہ نہیں کیا تھی۔ پر پچاس کا معلوم ہوتا تھا۔ کہنے لگا:

غلام نبی نے یہ بھیجا ہے۔ میں اس کا دوست ہوں محمدو۔ یہ کہہ کر ایک میلے سے کپڑے کی پوٹلی میرے سامنے رکھ دی۔ کھول کر دیکھا تو نوٹ اور روپے اور کچھ ریزگاری۔ گنے تو پانچ اوپر ساٹھ روپے اور دس آنے ہوئے۔ وہ بولا:

غلام نبی نے کہا تھا کہ ماں سے کہنا اس روپے سے زعفرانی کا بیاہ کر دیں۔

میں نے خدا کا شکر کیا کہ بیٹے کے دل میں ماں بہن کا خیال تو آیا پھر محمدو کے منہ پر کچھ عجیب سی حالت دیکھ کر پوچھا: کہو غلام نبی کا کیا حال ہے وہ نہیں آیا۔

محمدو کے گلے میں آواز پھنسی معلوم ہوتی تھی۔ بھنچ بھنچ کر بولا جیسے رونا نہ چاہتا ہو۔

"ماں جی! غلام نبی تو چل بسا۔ اسے دق ہوگئی تھی۔" اور رب جب ہوگیا۔

...... بیٹا تم لوگ نہیں سمجھ سکتے کہ بیٹے کی موت کا ماں پر کیا اثر ہوتا ہے..... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلیجے کا ٹکڑا کاٹ کر کسی نے نکال لیا ہو۔ ماں نو مہینے بچے کو پیٹ میں رکھتی ہے نا۔ دو سال دودھ پلاتی ہے۔ بچہ اس کے خون، اس کے گوشت پوست سے بنتا ہے اور پھر وہ بڑا ہو کر غلام نبی کی طرح چوڑے چکلے سینے والا نوجوان ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ گدھے کی طرح صاحب لوگوں کا سامان ڈھوتے ڈھوتے خون کی کھانسی کھانستا ہوا مر جاتا ہے اور اس کے ساتھ ماں بھی مر جاتی ہے اور سب سے بڑی موت یہ ہوتی ہے کہ وہ پھر بھی زندہ رہتی ہے۔

میرا تو جو حال ہوا سو ہوا۔ زعفرانی پر بھائی کی موت کا کچھ عجیب ہی اثر ہوا۔ چھوٹے بھائی کی پڑھائی کی فکر اور بھی بڑھ گئی۔ ہر وقت اس کی جان پر سوار۔ بیٹھی کر پڑھ۔ تختی لکھ۔ مدرسے کا کام کر۔ لڑکے کو ذرا بھی کھیلنے کودنے نہیں دیتی۔ جیسے اسے کوئی خواہش جلدی ہو کر سال بھر کی مدرسے کی پڑھائی دو چار دن ہی میں پوری ہو جائے۔ نہ جانے کیوں اتنی جلدی تھی سے نہ جانے کیوں؟ ہاں اور محمدو کے پاس بیٹھ کر زعفرانی نے بھائی کے آخری ایام کا سب حال کرید کرید کر پوچھا۔ کب اور کیسے بیمار پڑا۔ علاج ہوا یا نہیں

کیا سب سامان ڈھونے والے مزدوروں کو اسی طرح دق ہو جاتی ہے؟

اور جب محمدو نے کہا:

"ہاں بہت سوں کو" تو نہ جانے کیوں زعفرانی نے اس سے پوچھا:

تو کیا تم واپس جا کر پھر یہی کام کرنے لگو گے یہاں کیوں نہیں رہ جاتے؟...... نہ جانے کیوں... میرے کہنے سے محمدو یہاں تین دن اور ٹھہرا۔ جس روز وہ جا رہا تھا میں نے اس سے پوچھا:

"کیوں محمدو! جب یہ کام اتنا خطرناک ہے تو چھوڑ کیوں نہیں دیتا؟"

وہ بولا

چھوڑ کر کیا کروں گا ماں جی۔ اور کوئی کام آتا نہیں ہے اور پھر کوئی آگے ہے نہ پیچھے، نہ ماں نہ باپ۔

میں نے جلدی سے پوچھا۔

اور بیوی؟

اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

کب کی مر گئی۔

پتہ نہیں وہ میرا مطلب سمجھا یا نہیں پر میں نے کہا:

دوسری کیوں نہیں کر لیتے؟

اس کو تین دن میں ہنستے تو کیا مسکراتے بھی نہ دیکھا تھا۔ پر اس بات پر اس کی آنکھوں میں ایک سی چمک پیدا ہوئی۔ اس کے سوکھے چمڑے جیسے چہرے پر ہنسی کی لکیریں سی پڑ گئیں۔

مجھ سے کون بیاہ کرے گا ماں جی!

لو بیٹا وارا نیارا زعفرانی کا بیاہ محمدو سے طے پایا۔

... کیا کہا زعفرانی کی رائے؟ بیٹا بھلا شادی بیاہ کیا لڑکیوں کی مرضی سے ہوتے ہیں۔ پر میں نے زعفرانی سے ذکر کیا کہ اگلے چاند کی بیسویں کو محمدو سے بیاہنے آئے گا تو یہ تو میں نہیں کہوں گی کہ وہ سن کر خوش ہو گئی، جیسا شریف لڑکیاں کیا شادی کے ذکر پر خوش ہوا کرتی ہیں پر اس کے چہرے سے اطمینان ضرور ٹپکتا تھا۔ جیسے اب اس کی کوئی چنتا دور ہو گئی ہے۔

شادی کی چھوٹی موٹی تیاریوں میں دن گزر گئے۔ ہاں بیٹا ہم غریبوں کو بھی کچھ نہ کچھ تو دینا ہی پڑتا ہے۔ چاہے ایک ہی جوڑا اور دو چاندی کے بالے ہوں۔ جس دن محمدو آنے والا تھا اسی دن میں نے سویرے ہی سے زعفرانی کو اٹھا کر نہلا دھلا کر شادی کا جوڑا پہنا دیا۔ گلابی رنگ کا پیراہن اور اس کے نیچے سبز پھولدار چھینٹ کی شلوار۔ ہم پرانے زمانے کی کشمیری عورتیں بس لمبے لمبے پیراہن ہی پہنا کرتی تھیں مگر اس شیر کشمیر کے کہنے سے آج کل لڑکیوں نے شلواریں بھی پہننی شروع کر دی ہیں یہاں تک کہ زعفرانی بھی مجبور کرتی تھی کہ ماں شلوار پہنو نہیں تو شیر کشمیر خفا ہو جائیں گے۔ شیر دیر سے تو ڈرے میری بلا، پر عورتیں بھی شلوار پہننے لگی تھیں۔ سو میں نے سوچا میں ہی کیوں نکو بنوں سو میں نے سلوائی۔ اتنا غصہ آیا ہے مجھے اس شیر کشمیر پر کم بخت کو اگر پکڑا جانا تھا تو کیا اسے وہی دن جڑا تھا جب میری بچی کا بیاہ طے پایا تھا۔ یکایک سارے گاؤں میں شور مچ گیا شیر کشمیر پکڑے گئے۔ شیر کشمیر پکڑے گئے۔ مجھے کیا پتہ کیوں سرکار نے اسے پکڑا تھا.... میری طرف سے اگر سال کے بارہ مہینے قید رکھا جاتا تو اور بھی اچھا تھا پر یہ ضرور سنا کہ اب کے اس نے خود راجہ ہی کو ریاست سے باہر کرنے کی بات چلائی تھی۔ میں نے کہا اب اس شیر نے شیر ببر کے بھٹ میں منہ ڈالا ہے۔ اب یہ زندہ نہیں بچے گا۔ باہر شور کی آواز ہوئی تو میں گلی میں آئی یہ سوچ کر کہ شاید محمدو اور اس کے ساتھی برات لائے ہوں۔ مگر وہاں تو بچے دھینگا مشتی مچا رہے تھے۔ دو چار لال جھنڈے جن پر ہل بنا ہوا تھا لیے شیر کشمیر زندہ باد، ڈوگرا راج مردہ باد کہتے پھر رہے تھے اور ہمارا غفورا چھ اینٹوں کا چبوترہ بنائے سفید کھریا سے دیوار پر کچھ لکھ رہا تھا اور زور زور سے بچے پڑھتے جاتے تھے۔

ک۔ ش۔ م۔ ی۔ ر چھوڑ دو..... اور زعفرانی دروازے میں کھڑی غفورا کو دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر اتنی خوشی تھی کہ جیسے اس نے ایک بڑا کام پورا کر لیا ہو۔

ہاں تو ابھی میں اندر جا کر بیٹھی ہی تھی کہ باہر سے رونے اور چلانے کی آوازیں آئیں جو دیکھا تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ایک خالی

رنگ کی موٹر لاری کھڑی تھی اور اس میں سے سپاہی کود کر بچوں کو چھریوں سے مار رہے تھے۔ میں دیوار کی طرف دوڑی جہاں پل بھر پہلے غفورا کھڑا ہوا مرہائی سے کھیل رہا تھا۔ غفورا اب نہیں تھا۔ ہاں خون کی ایک لکیر زمین پر کھنچی ہوئی تھی اور اس لکیر کی سیدھ میں جو میں نے دیکھا تو غفورا کو زمین پر بے ہوش پڑا پایا۔ اس کے سر میں ایک گہرا گھاؤ تھا جس میں سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ابھی تک ٹھیکرے کا ٹکڑا تھا۔ میں اپنے غفورا کو اٹھا کر اندر لے آئی اور وہاں اپنی بہن کی گود میں اس نے جان دے دی اور بے ہوشی میں بھی آخر وقت تک اس کے ہونٹ انہی گیتوں کو دہراتے رہے جنہیں وہ باہر دیوار پر لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ل۔ تی۔ م۔ ی۔ راو رابھی انہیں کہہ پایا تھا کہ گڑگڑاہٹ کے ساتھ بجلی آئی اور اس مہینے میں دوسری بار مجھے موت آئی پر نہ آئی۔ اور اس کے بعد کیا ہوا بیٹا یہ مجھے ایسا یاد ہے جیسے کوئی ڈراؤنا خواب ہو جس میں ایک خوفناک بات کا دوسری خوفناک بات سے کوئی تعلق نہ ہو مگر پھر بھی خوف اور دہشت کا پہاڑ اٹھتا چلا جائے۔

....زعفرانی کی آنکھیں جو کبھی کنول سے ملتی جلتی ہوا کرتی تھیں اس وقت دو دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح تھیں۔ آنسوؤں کا نام نہیں تھا۔ نہیں تو وہ آگ بجھ جاتی جو اس وقت ان میں سلگ رہی تھی......اور پھر سارے گاؤں والوں کا ایک جلوس۔ مردوں سے آگے عورتیں اور عورتوں میں سب سے آگے آنکھوں میں وہی دہکتی ہوئی آگ اور یہ سارا مجمع کٹے ہوئے کھیتوں میں سے ہو کر سڑک کی طرف جاتا ہوا جہاں بالکل اسی جگہ جہاں تمہاری موٹر کھڑی ہے سپاہیوں کی خاکی لاری کھڑی تھی۔
...بڑی بڑی مونچھوں اور کالی رنگت والے سپاہی اور ان کی بندوقیں جو ٹکٹکی باندھے اس جلوس کی طرف، ان عورتوں کی طرف، زعفرانی کی طرف دیکھ رہی تھیں......

......ایک تڑاخہ دس بار تڑتڑائے۔ سب تتر بتر ہو کر بھاگے اور اس کھیت کے بیچوں بیچ اپنی چھاتی کو سنبھالتی ہوئی زعفرانی نرم مٹی میں اس طرح گری جیسے ماں کی گود میں بچہ آن کر گر پڑے۔ میں ادھر بھاگی۔ پر جب تک میں پہنچوں زعفرانی کی چھاتی میں سے خون کی ایک دھار بہتی ہوئی کھیت کی سوکھی مٹی کو سیراب کر رہی تھی۔ عورت کی چھاتی اور اس میں سے دودھ کے بجائے خون مٹی میں مل رہا تھا اور میری بیٹی میری گود میں جان دے رہی تھی۔ مرتے دم تک اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور نہ جانے کیوں آخری ہچکی سے پہلے اس نے مسکرا کر مجھ سے کہا:

"میرا بیاہ ہو گیا ماں۔"

......یہیں اس کھیت میں جہاں تم اب گل لالہ کی طرح سرخ زعفران کے پھول دیکھتے ہو۔"

سن لی بیٹا تم نے میری کہانی؟...... پر تم کہاں ہو...... چلے گئے نا تم...... میں نہ کہتی تھی کہ ابھی تمہاری موٹر ٹھیک ہو جائے گی اور تم لوگ چلے جاؤ گے اور کہانی نہ سن پاؤ گے۔

موٹریں تو اس سڑک سے روز ہی بھاگتی ہیں بیٹا! دھول کو چھوڑتی بھی ہیں تو پھر دھول کے بادل اڑاتی نکل جاتی ہیں پر یہ زعفران کی کھیتی یوں ہی کھڑی رہے گی، یہاں تک کہ پھول چننے کا وقت آ جائے گا اور یہ لال لال لہو کی بوندیں جیسے شفق نے سمٹ کر سارا رنگ بھیج دیے ہیں اور نہ جانے ان کی خوشبو کہاں کہاں اور کس کس کے دسترخوان پر مہکے گی اور تمہاری طرح کتنے ہی آدمی سوال کریں گے کہ اس زعفران کا رنگ لہو کی طرح لال کیوں ہے!...... پر کوئی نہ بتا پائے گا کیونکہ اس کی وجہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں۔

ساقنیل

یہ ۱۹۲۰ء کے موسم بہار کی ایک سہانی صبح تھی۔ میں قدیم بیت المقدس کی گلی بیرکس میں مخملی گھاس پر بیٹھا شیو بنا رہا تھا — ان دنوں بیت المقدس کی سرزمین ہنگاموں سے پُر تھی۔ عربوں میں آزادی کی تحریک زور پکڑ گئی تھی اور انگریزوں کے خلاف بغاوتیں ہو رہی تھیں۔

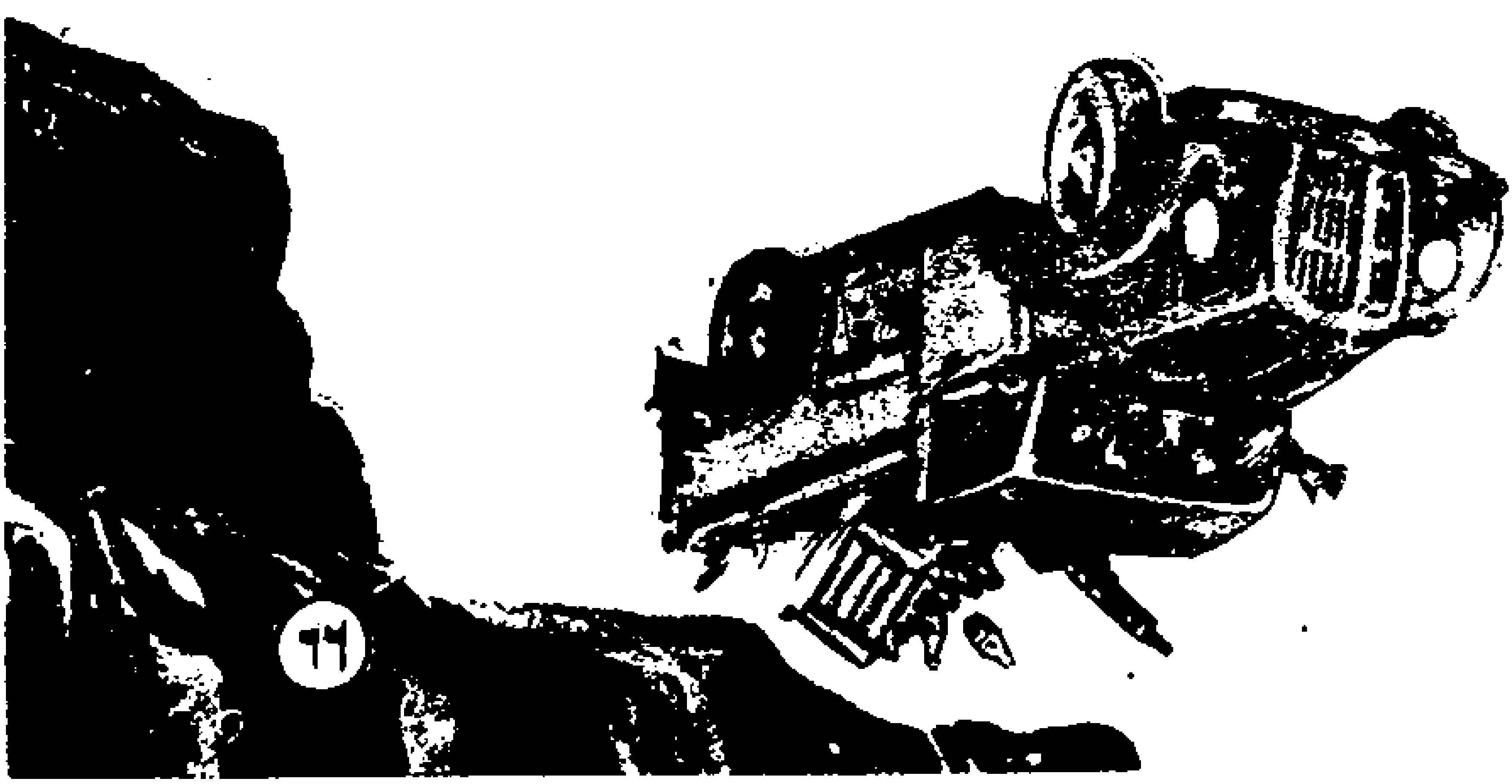
ریزر نے ابھی میرے چہرے کا ایک ہی رُخ صاف کیا تھا کہ آرچی پٹ ہانپتا ہوا آیا۔

"غضب ہو گیا! عربوں نے وادی لفتا کے قریب ہماری ایک لاری کو لوٹ لیا اور لاری میں بیٹھے ہوئے تمام انگریزوں کو ختم کر دیا ہے۔"

ریزر میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ میں نے تولیے سے منہ صاف کیا اور پستول جیب میں ڈال کر آرچی پٹ کے ساتھ موٹر میں بیٹھ گیا۔ آرچی کی بھری ہوئی رائفل دائیں سیٹ کے نیچے رکھی تھی۔ موٹر کے پچھلے کھلے حصے میں راشن لدا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہماری موٹر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ میں نے زندگی بھر اتنی تیز موٹر نہیں چلائی تھی۔ آرچی کبھی میرے چہرے کو اور کبھی میٹر کی سوئیوں کو دیکھتا جو لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھتی جا رہی تھیں، وہ انجانے خوف سے کانپنے لگا، لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ جس لاری کے مسافروں کو عربوں نے قتل کیا تھا، اس میں میرا جواں سال بیٹا بھی تھا۔ میرا دماغ کھول رہا تھا اور دل ڈوبنے لگا تھا۔ مجھے تو صرف اتنا یاد ہے کہ ایکسی لیٹر پر پاؤں پڑتے ہی موٹر ایک دھچکے کے ساتھ چلی اور پھر پوری رفتار سے فراٹے بھرنے لگی۔ اچانک میری نظر سامنے آئینے پر پڑی، چہرے کا دایاں حصہ صاف اور بائیں پر بڑھی ہوئی داڑھی دیکھ کر میں ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ آرچی میری اس دیوانگی کو دیکھ کر اور سہم گیا۔۔۔

"تم کیا کر رہے ہو، ڈوڈی!" اس نے چیخ کر کہا۔

میں نے جواب دیے بغیر ایکسی لیٹر پر اور بوجھ ڈال دیا، سوئی اسی اور نوے کے ہندسوں کے درمیان لرزنے لگی۔ ٹائروں کی چرچراہٹ



دھماکوں میں بدل گئی۔ سڑک پر بچھی ہوئی بجری کی کنکریاں ٹائروں کے کناروں سے پھسل کر تیر کی طرح اِدھر اُدھر پڑنے لگیں۔ موٹر کے پچھلے کھلے حصے میں راشن کی چیزیں لڑھک رہی تھیں۔ مشروبات کی بوتلیں کریٹ سے نکل کر ہوا میں فٹ بال کی طرح اچھل رہی تھیں، لیکن میرا پاؤں ایکسی لیٹر کو دباتا ہی چلا گیا۔

ہماری موٹر جس سڑک پر دوڑ رہی تھی اس پر عام گاڑیاں کم ہی چلا کرتی تھیں۔ یوں بھی اس زمانے میں عربوں کے پاس موٹریں کم تھیں۔ گھوڑا گاڑیوں اور اونٹ گاڑیوں کے لیے الگ سڑک تھی اور پیدل چلنے والے اسی سڑک کو استعمال کرتے تھے۔ یہ سڑک جس کا نام جافر روڈ تھا، کشلی بیرکس سے سات کلومیٹر تک سیدھی نشیب کی طرف چلی گئی تھی۔ اس انتہائی ڈھلوان سڑک پر موٹر تیسرے یا دوسرے گیئر میں چلتی ہے، لیکن میں ٹاپ گیئر میں نوّے کی رفتار سے لڑھک رہا تھا۔ میری دائیں طرف اونچے اونچے پہاڑ تھے اور بائیں جانب گہری وادیاں۔ سڑک بھی اتنی کم چوڑی تھی کہ ذرا سی چوک پر موٹر گہرے کھڈوں میں گر کر چکنا چور ہو جاتی۔ اچانک میری نظر سامنے سے ہٹ کر بائیں جانب پھسل گئی۔ نیچے وادیٔ شول میں بچے بالے کھیل رہے تھے، دکانوں پر بھیڑ تھی اور عرب عورتیں چہروں پر نقاب ڈالے گھوم رہی تھیں۔ میرے احساس کی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ شول کی وادی میں زندگی رواں دواں تھی اور میں ——— موت کے سائے کی طرح وادیٔ نفتا کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں چند گھنٹے پہلے میرا لختِ جگر خون میں غلطاں آخری سانس لے رہا تھا۔

ساتویں میل پر سڑک یک دم گھوم جاتی تھی اور بالکل سانپ کی کنڈلی کی طرح بل کھاتی ہوئی اوپر اٹھ کر پیچھے کی جانب مڑ جاتی تھی۔ اس موڑ کے بالکل سامنے پہاڑی کا دوسرا سرا تھا جو سر اٹھائے عمودا کھڑا تھا۔ ہماری سڑک اور سامنے کی پہاڑی کے درمیان وادیٔ نفتا تھی۔ پانچ سو فٹ گہری وادی میں دو ڈھائی سو گھر آباد ہوں گے۔ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان پچاس گز کا فاصلہ تھا

اور اسی جگہ تھوڑی آبادی تھی۔ میں سیکڑوں مرتبہ یہاں آیا تھا۔ اس موڑ سے بارہا گزرا تھا۔ سڑک کے نشیب و فراز کو ہزار بار دیکھا تھا۔ ساتویں میل کے نزدیک پہنچتے ہی میرا پاؤں ایکسی لیٹر سے از خود ہٹنا شروع ہو جاتا۔ گاڑی کی رفتار آہستہ ہو جاتی اور بریک لگ جاتا۔ مجھے اپنے اوپر پورا اعتماد تھا۔

مسافت بتانے والا پتھر زن سے پیچھے رہ گیا۔ آرچی کی پھٹی ہوئی نظروں نے اس پر پانچ کا ہندسہ پڑھ لیا تھا۔

"خدا کے لیے موٹر آہستہ کرو۔" آرچی نے گھبرا کر کہا۔

میرے پاؤں کا دباؤ اور بڑھ گیا۔ رفتار پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی۔ میٹر کی سوئی یک دم پچانوے پر پہنچ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہر چیز گھوم رہی ہے اور پہاڑ لرز رہے ہیں۔ میں نے سٹیرنگ کو پوری قوت سے تھام لیا اور اپنی کمر کو سیٹ کی پشت پر جما کر خود کو اکڑا لیا۔

"ڈوڈی! موت ہے، کھیلو مجھ پر رحم کرو۔ رفتار کم نہیں کرتے تو مجھے اتار دو۔" آرچی گڑگڑانے لگا۔

معلوم نہیں مجھے اس روز کیا ہو گیا تھا۔ میں آرچی کی التجاؤں سے بے نیاز تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا۔ میل ظاہر کرنے والا پتھر ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے آیا اور گرد کی طرح پیچھے رہ گیا۔ اس پر یقیناً چھ کا ہندسہ لکھا تھا۔ میں نے میٹر پر لرزتی ہوئی سوئی کے سرخ سرے کو دیکھا جو اشارے سے میل فی گھنٹہ کی رفتار ظاہر کر رہا تھا۔ سامنے سفید پتھر تھرتھرا رہا تھا جس پر سات کا ہندسہ دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی خطرناک موڑ کی علامت ظاہر کرنے کے لیے سائن بورڈ موجود تھا۔

آرچی خوف اور دہشت کے باعث دنگ ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکل رہی تھی۔ میں اب کسی صورت بھی موٹر کو موڑ نہیں سکتا تھا۔ اُف میرے خدایا! سامنے پانچ سو فٹ گہری وادی اور اس کے بعد عمودی —— میں لرز اٹھا۔ میرے ہاتھ کپکپانے لگے۔ میرا پاؤں

ایکسی لیٹر سے ہٹ کر ایک دم بریک پر پڑا ، پھر ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ ہماری موٹر ہوا میں اچھلی اور قلابازی کھاتی ہوئی سڑک سے نیچے گہری وادی میں لڑھکی۔ وادی اور سڑک کے درمیان ایک اور چٹان تھی جو تیر کی طرح نوکیلی تھی اور جاقہ روڈ کے اس موڑ سے ذرا نیچے تھی۔ ہماری موٹر قلابازی کھا کر الٹی طرف سے اس چٹان سے ٹکرائی چٹان کا نوکیلا تیر موٹر کے عقبی کھلے حصے میں پیوست ہو گیا۔ چٹان سے ٹکراتے ہی آرچی کی سیٹ کے نیچے پڑی ہوئی رائفل اچھلی اور اس کا ٹریگر ربڑ کے کسی سخت حصے سے ٹکرا گیا — ٹریگر دبتے ہی ایک خوفناک آواز کے ساتھ گولی آرچی کے بائیں پاؤں کو چھوتی ہوئی سامنے کے شیشے سے پار ہو گئی۔

جب مجھے ہوش آیا، میں کمپانڈ ملٹری ہسپتال کے میڈیکل وارڈ میں بستر پر لیٹا تھا۔ سامنے کرسی پر آرچی بیٹھا تھا جو پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر وہ خوشی سے پاگل ہو گیا۔ میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی، سات بج کر چھتیس منٹ اور اکیس سیکنڈ ہوئے تھے۔ میں نے گھڑی کو کان کے قریب لا کر ٹک ٹک سننا چاہی، وہ بالکل خاموش تھی — دراصل چابی دیتے کے وقت اس کی مشین ختم گئی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے جب میں نے پہلی بار ایکسی لیٹر پر پاؤں رکھا تھا، میری نظروں نے گھڑی کی سوئیوں کا جائزہ لیا تھا، اس وقت ٹھیک سات بج کر بتیس منٹ ہوئے تھے، گویا ہم نے سات میل کا یہ فاصلہ چار منٹ اکیس سیکنڈ میں طے کیا تھا۔ مجھے اور آرچی کو کوئی چوٹ نہیں آئی تھی، صرف رائفل کی گولی چلتے وقت اس کی ٹانگ معمولی سی زخمی ہو گئی تھی۔

ہم دونوں ہسپتال سے نکل کر وادی افسا میں پہنچے۔ پولیس نے ہماری موٹر کے اردگرد گھیرا ڈال رکھا تھا۔ عرب بچے، عورتیں اور مرد اس عجیب و غریب منظر کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہماری کار کو ایک بڑی میخ کے ساتھ اس چٹان میں گاڑ دیا گیا ہے۔ ہم دونوں خدا کا شکر بجا لائے۔ ■■



بلجیم کی ایک شام

مستانہ چل رہی ہے ہوائے سبک خرام — خوش رنگ پھول ہیں کہ چھلکتے ہوئے ہیں جام

بادل ہیں یہ کہ خلد سے آئے ہوئے پیام — نظریں ہیں بامراد تو ہے روح شاد کام

خاموش لے میں تو نے وہ نغمہ سنا دیا — دوری کا ہر حجاب نظر سے اٹھا دیا

جلوہ مجھے نہ جانے کہاں کا دکھا دیا — تو نے کیا طلسم کا ایسا کچھ اہتمام

اے شام ہے طلسم ترا دُور دُور تک — میری نظر سے میرے دلِ ناصبور تک
لے جائیں وہ سلام مرا برق طور تک — ممکن ہو گر تو اپنی ہواؤں کو دے پیام

اے بلجیم کی شام

اے بلجیم کی شام ہوں اپنے وطن سے دور — جس طرح عندلیب ہو کوئی چمن سے دو
اک گلبدن کی یاد ہے یوں گلبدن سے دور — جیسے چکور کو ہو جنونِ مہِ تمام

اے بلجیم کی شام

اے شام اے ترنگ کا نظّارہ حسیں — کیا دل نواز ہے یہ تری سانولی جبیں
مانا ترا دیار بھی جنّت سے کم نہیں — لیکن مری نگاہ میں ہے اور ہی مقام

اے بلجیم کی شام

دامن میں تیرے چمکا ہے چرخِ بریں کا چاند — میری نگاہ میں ہے اک ایسا زمیں کا چاند
شرمندہ جس کو دیکھ کے ہو چودہویں کا چاند — اس کی ہر اک کرن ہے مری زندگی کا دام

اے بلجیم کی شام



دُوسری جنگِ عظیم نقطۂ عروج پر تھی۔ نازی فوجیں جنرل رومیل کی قیادت میں اتحادی فوجوں پر زبردست دباؤ ڈال رہی تھیں اور اتحادی ہوائی فوج "بن غازی" شہر اور بندرگاہ پر تابڑ توڑ حملے کر رہی تھیں، لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ اتحادیوں کی زبردست بمباری کے باوجود بن غازی کی بندرگاہ دو سال تک محفوظ رہی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ نازی فوجوں نے اتحادی ایئر فورس کو دھوکہ دینے کے لیے اصل بن غازی شہر سے دس میل دُور ایک مصنوعی شہر تعمیر کر رکھا تھا اور ان کے طیارے ہمیشہ نقلی شہر پر بمباری کر کے چلے جاتے تھے۔ آخر لیفٹیننٹ نارمن اپالڈ کے جرأت مند قدم نے اس راز سے پردہ اُٹھایا اور جنرل رومیل کی طاقت کو ہمیشہ کے لیے شمالی افریقہ سے ختم کر دیا۔

نارمن اپالڈ نے اپنے بمبار طیارے [illegible] کا رُخ تبدیل کیا اور مائیکروفون پر اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا:

"راؤنڈ پورا ہو چکا ہے ...... میں بیس ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے آ رہا ہوں ......"

چند سیکنڈ بعد آپریٹر کی آواز نارمن کے کانوں سے ٹکرائی:

"سب ٹھیک ہے ......"

اور ان مختصر جملوں کے ساتھ ہی دُوسری جنگِ عظیم کے ان گنت ڈراموں میں سے ایک اور ڈرامے کا آغاز ہوا جس کی تفصیلات تب

منظرِ عام پر آئیں تو دُنیا حیران رہ گئی۔ ۱۹۴۱ء میں ہٹلر کی فوجیں بن غازی کی بندرگاہ پر قابض ہو چکی تھیں اور بندرگاہ پر قابض رہنے کے لیے جان توڑ کر لڑ رہی تھیں۔ فیلڈ مارشل اروین رومیل اتحادی فوجوں کی اچھی طرح پٹائی کر رہا تھا اور اُس کی نت نئی جنگی چالوں نے بڑے بڑے اتحادی جنرلوں کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ رومیل نے دوسری جنگِ عظیم میں جو کارنامے پیش کیے وہ نہایت عجیب ہیں اور ان ہی کارناموں میں سے ایک کارنامہ مصنوعی بن غازی کی تعمیر بھی ہے۔ رومیل نے اصلی اور نقلی دونوں بندرگاہوں کی حفاظت کا معقول انتظام کر رکھا تھا۔ چپے چپے پر طیارہ شکن توپیں نصب تھیں اور جب بھی اتحادی طیارے بم باری کرنے نمودار ہوتے، اِن سینکڑوں توپوں کے دہانے بیک وقت آگ اُگلنے لگتے اور ہر حملے میں اتحادی ایئر فورس کو اپنے بہت سے طیاروں سے ہاتھ دھونے پڑتے۔

رومیل نے یہ چال چل رکھی تھی کہ اتحادی طیارے بن غازی پر بم باری کے لیے جب بھی آتے تو مصنوعی شہر کو روشن کر دیا جاتا تھا۔ آخر ہوتا یہ تھا کہ جیسے ہی … شہر کو دیکھنے کے لیے روشنی کے گولے پھینکتے تو جرمن توپیں … کے گولے اُگلنے لگتیں اور دیکھتے ہی دیکھتے … میں چھپ جاتی اور یوں اتحادیوں … کا … اصلی بن غازی کی نشان دہی سب سے بڑا مسئلہ تھا جو کسی طرح حل ہونے میں نہ آتا تھا اور نارمن اوپالڈ اس وقت … بندرگاہ کا سراغ لگانے کے لیے اپنے بم بار طیارے میں … پرواز کر رہا تھا۔ اس نے دل میں مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ … بندرگاہ کا سراغ لگا کر اسے ختم کر دے گا یا خود ختم ہو جائے گا۔ اسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اصلی بن غازی کو برباد کرنا بچوں کا کھیل نہیں، کیوں کہ رومیل نے بندرگاہ کو بچانے کے لیے نہایت کڑے اور پیچیدہ انتظامات کر رکھے ہیں۔ اُس نے اپنے طیارے کی اسکرین پر نگاہ ڈالی۔ بلیک آؤٹ کی وجہ سے بندرگاہ، گہری تاریکی میں غرق ہو چکی تھی۔ نارمن اوپالڈ نے ٹرانسمٹ بٹن دبا کر اپنے ساتھیوں کو تیار رہنے کا حکم دیا۔ وہ شاید اپنے دل میں کوئی فوری فیصلہ کر چکا تھا۔ دفعتہً طیارے کے پچھلے حصے میں بیٹھا ہوا مشین گن آپریٹر اپنے مائیکروفون پر چلایا:

"فائر..... وہ طیارے پر فائرنگ کر رہے ہیں۔"

نارمن نے فوراً اسکرین پر دیکھا۔ بے شک طیارے کے گرد کئی شعلے پھیلے ہوئے تھے، جو غالباً طیارے کی آواز سُنتے ہی فضا میں بلند ہونا شروع ہو گئے تھے۔ "دوستو!" نارمن نے نہایت سکون سے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ "جرمن توپوں کے دہانوں سے نکلنے والے ان شعلوں پر کڑی نظر رکھو، اس طرح ہمیں اصل بندرگاہ کا سُراغ مل سکے گا۔"

طیارے کے دائیں ونگ میں نیوی گیٹر اوڈیل کی ڈیوٹی تھی۔ وہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتے ہوئے شعلوں کے بارے میں نارمن کو برابر مطلع کر رہا تھا۔ نارمن پلک جھپکائے بغیر اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ گولوں کے پھٹنے سے شعلے اس کے طیارے کے ارد گرد تیزی سے لپک رہے تھے۔ بڑا عجیب اور ڈراؤنا منظر تھا۔ توپ کا گولہ جوں ہی طیارے سے ذرا فاصلے پر پھٹتا، چند ثانیوں کے لیے فضا روشن ہو جاتی اور پھر وہی اتھاہ تاریکی اور سناٹا —— طیارہ آگ کے طوفان سے گزر رہا تھا۔ نارمن کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ آگ کے شعلوں کے ایک بیکراں سمندر میں گھر گیا ہے۔ اس نے یکایک فیصلہ کیا کہ طیارے کی بلندی کو اور کم کر دیا جائے۔ اسکرین پر نقطوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ اس تنہا طیارے پر سینکڑوں جرمن توپوں نے اپنے اپنے مُنھ کھول دیے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد پھٹتے ہوئے گولوں کے ٹکڑے طیارے سے آن آن کر ٹکرانے لگے۔

ہم کبھی...... کبھی یہ چکّر پورا نہیں کر سکتے۔"

"بکواس بند کرو اور تیل کے دباؤ کا خیال رکھو۔" نارمن غصّے سے بے تاب ہو کر دھاڑا۔

بم بار طیّارہ جوں ہی بن غازی کی حدود میں داخل ہوا، ہر جرمن توپ گولے اُگلنے لگی۔ نارمن نے سکرین پر مغرب کی طرف دیکھا۔ تقریباً سارا شہر روشن تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہی وہ شہر ہے جو نازیوں نے اتحادی ایئر فورس کو دھوکہ دینے کے لیے بنایا ہے۔ مشرق کی طرف بھی دور فاصلے پر طیّارہ شکن توپیں گولے پھینک رہی تھیں۔ یہ توپیں اصل بن غازی شہر اور بندرگاہ پر نصب تھیں۔ اس طرح نارمن کے سامنے اصل شہر اور بندرگاہ کا محل وقوع واضح ہو گیا۔ بندرگاہ کی طرف سے زبردست گولہ باری ہو رہی تھی۔ نارمن کا طیّارہ ابھی تک محفوظ تھا اور وہ خود حیران تھا کہ گولوں کی بارش میں طیّارہ کیسے محفوظ ہے۔ مصنوعی شہر کو بار بار روشن کیا جا رہا تھا۔ وہ یہ روشنی دیکھ کر مسکرایا اور کہنے لگا:

"نازی گدھو! اب تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ یہی وہ روشنیاں ہیں جو ہمارے پائلٹوں کو مغالطے میں ڈال دیتی ہیں۔"

جرمن طیّارہ شکن توپچی اپنی پوری کوشش سے بم بار طیّارے پر آگ برسا رہے تھے۔ اصل میں وہ اس ایک اتحادی طیّارے کو اپنے اس قدر قریب پا کر بوکھلا گئے تھے۔ نارمن جہاز کے توازن کو برقرار رکھنے کی جان توڑ کوشش میں لگا ہوا تھا۔ کبھی وہ سکرین کو دیکھتا اور کبھی توپ کے گولوں کی نارنجی، قرمزی اور سُرخ رنگ کی لاتعداد روشنیوں میں اصل بن غازی شہر اور بندرگاہ پر نظریں دوڑاتا۔

"اب وہ نہیں بچ سکتے۔ میں نے انھیں دیکھ لیا ہے۔" نارمن نے جوشیلی آواز میں اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "تیسرے راؤنڈ میں بم گرانے کے لیے تیار رہو۔"

"تیسرا راؤنڈ!" طیّارے کا عملہ حیران تھا کہ نارمن کر کیا رہا ہے۔ تیسرا راؤنڈ پورا کرنے کے لیے کسی معجزے کی ضرورت ہے۔ معجزہ کہاں رونما ہو گا؟ آخر اوڈیل نے تنگ آ کر کہا۔ "نارمن، جیمز دیکھنے کے لیے ہماری اور اپنی جان کو خواہ مخواہ خطرے میں ڈال رہے ہو۔ تیسرے راؤنڈ کا خیال ترک کر دو۔"

"لعنت ہے تیری بیہودہ رائے پر۔" نارمن نے گرج کر کہا۔ "میں تیسرے راؤنڈ میں ضرور کامیاب رہوں گا۔ گھبراؤ نہیں۔ غیبی طاقت میرے کان میں کہہ رہی ہے کہ ہم اس مرتبہ لازماً جیتیں گے۔"

ابھی وہ کچھ اور کہتا، لیکن یکایک طیّارے نے ایک جھٹکا کھایا اور پھر تیزی سے زمین کی طرف جانے لگا۔ نارمن کے ہاتھ سے مائیکروفون کے ریسیور کھسک گئے، مگر اس نے فوراً اپنے قابو پایا اور وائیں رڈل پر پورا دباؤ ڈالتے ہوئے طیّارے کا توازن دوبارہ درست کیا۔ اس کی ٹانگ میں شدید درد ہو رہا تھا اور حلق خشک ہو چکا تھا۔ پہلی بار اُسے خطرے کا صحیح معنوں میں احساس ہوا، مگر...... کچھ ہو...... وہ تیسرا راؤنڈ ضرور لگائے گا...... ضرور...... وہ اپنے مشن میں ناکام نہیں لوٹے گا۔

مغرب کی طرف سے یکایک تین میس کے قریب جرمن ایئر فورس کے طیّارے نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ۲۴ بی کے گرد گئے۔ ان میس طیّاروں کے پائلٹوں میں ہینز جیکیم مارسیلی بھی تھا جو "افریقہ کا پائلٹ" کے نام سے مشہور تھا اور جرمن ایئر فورس میں "جان باز ہیرو" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ نارمن اور پالڈ نے تیسرا راؤنڈ لگانے کے لیے طیّارے کا رُخ بن غازی کی طرف جرمن پائلٹ ہینز جیکیم نے پھرتی سے اس کا تعاقب شروع کر

"ساتھیو! حملے کے لیے تیار رہو۔" نارمن نے مائیکروفون پر کہا اور طیّارے کی رفتار تیز کر دی۔ جرمن طیّاروں نے اگرچہ

یارے کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا تھا لیکن اس کے باوجود
ں سے کافی دور ہی رہے۔ شاید وہ بھاری بمبار ۲۴-بی سے
ف زدہ ہو گئے تھے۔ البتہ مینز جیکم ۲۴-بی کے پیچھے پہنچ کر
یاں برسا رہا تھا۔

یوں تو ۴۲ء کے اوائل ہی میں جنگی نقطۂ نظر سے بن غازی کی
رگاہ خاصی اہمیت حاصل کر چکی تھی۔ برطانوی اور امریکی طیارے
رو کے ہوائی اڈے سے اُڑ کر دو سال سے اس بندرگاہ اور شہر پر
مسلسل حملے کر رہے تھے، لیکن یہ حملے رومیل کی دور اندیشی اور جنگی
ری کے باعث ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھتے۔ اپنی سپلائی لائن کو
قائم رکھنے کے لیے رومیل ہر لحاظ سے شہر اور بندرگاہ کی حفاظتی تدابیر
مصروف تھا۔ بن غازی شہر اور بندرگاہ کو اتحادی قوت کی
رسے بچانے کے لیے اس قدر مکمل انتظام کیا گیا تھا کہ یہ دونوں
ہیں اتحادی طیاروں کی نظروں سے اتنے عرصے تک چھپی رہیں۔
رومیل نے برطانوی اور امریکی پائلٹوں کو دھوکہ دینے کے لیے دس
میل کے فاصلے پر ایک مصنوعی شہر بنا لیا تھا، جو تین سال تک
حادیوں کے لیے معمہ بنا رہا۔

۴۲ء میں فیلڈ مارشل منٹگمری نے نمبر آٹھ ڈویژن کے ساتھ
یک بھرپور حملہ کیا تاکہ نازیوں کو افریقہ سے باہر نکال دیا جائے۔
لامین کے مقام پر اُس نے رومیل کی فوجوں کو پیچھے دھکیلنا شروع
کیا اور سال کے اختتام پر تو فیلڈ مارشل منٹگمری کی کامیابی یقینی میں
بدلتی جا رہی تھی۔ منٹگمری کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح
اتحادی فوجیں ان بندرگاہوں پر قابض ہو جائیں، جن کی وجہ سے
نازی فوجوں کی سپلائی لائن قائم ہے تو یقیناً رومیل کو یہ ملک چھوڑنا
پڑے گا۔ جوں ہی صحرا میں سردیوں کا آغاز ہوا، امریکی اور برطانوی
ایئر فورس نے بن غازی پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے، لیکن بندرگاہ
بالکل محفوظ رہی اور اتحادیوں کی یہ پریہ گمان ہو سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ
بن غازی حاصل کرنے کے لیے جنگی چالوں میں تبدیلی لازمی ہو گئی
ہے۔

اُن ہی دنوں، جب کہ شمالی افریقہ میں اتحادی فوجوں پر
نازیوں کا دباؤ برابر بڑھتا جا رہا تھا، امریکا کی طرف سے اپنی فوجوں
کو پے در پے کمک پہنچنے لگی۔ سامان رسد اور اسلحہ بارود کے ساتھ ساتھ
مزید اعلا فوجی افسر اور پائلٹ بھی بھیجے گئے۔ پائلٹوں کو مصر کے ۲۷۶
بم گروپ کے لیے مخصوص کیا جاتا تھا، چناں چہ ان پائلٹوں کو
مصر بھیج دیا گیا۔ نارمن اور پالمڈ بھی ان میں شامل تھا۔

نئے پائلٹوں کے آنے کی اطلاع ملتے ہی مصر میں امریکی
ایئر بیس ہیڈکوارٹر کے انچارج کرنل میک گوائر اسی وقت پائلٹوں
سے ملنے کے لیے پہنچا۔ سب سے آخر میں اس نے نارمن اور پالمڈ سے ہاتھ
ملایا۔ وضع قطع سے نارمن پائلٹ کے بجائے ایک عام آدمی دکھائی
دیتا تھا۔ چھوٹا سا قد، چندھی آنکھیں اور دبلا پتلا جسم ـــ کرنل نے
نارمن کو غور سے دیکھا اور ابھی کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ نارمن بول پڑا۔
"کرنل! جنگ کہاں ہو رہی ہے؟ ہم مرنے مارنے کے لیے
بالکل تیار ہیں۔"

کرنل نے بے تابی سے اپنے ہاتھ ملے اور مغرب کی طرف دیکھتے
ہوئے جواب دیا: "آپ لوگوں کے آنے سے خوشی ہوئی۔ رہا جنگ کے
متعلق، تو یوں سمجھ لیجیے کہ وہ ہمارے چاروں طرف آگ کی طرح پھیلی
ہوئی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے نارمن کو ایک بار پھر اوپر سے نیچے تک
دیکھا اور [illegible] کچھ کہے بغیر جیپ میں سوار ہو کر چلا گیا۔ راستے میں [illegible]

"اونہہ ...... بے وقوف بچہ ...... کہتا ہے جنگ
کہاں ہو رہی ہے۔ اس گدھے کو اگر بن غازی کے جہنم کی سیر کرائی
جائے تو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا ..... بلڈی فول ..... نان سنس ..."

کرنل میک گوائر بہترین پائلٹ ہونے کے علاوہ اچھا کمانڈنگ آفیسر بھی تھا۔ نارمن اور پالڈ کے بارے میں اُسے وہی غلط فہمی ہوئی جو اُسے اکثر اس قسم کے آدمیوں کو دیکھ کر ہو جایا کرتی تھی۔ در اصل وہ ظاہری نام و نمود اور شخصیت کا قائل تھا۔ اس نے نارمن کے خط و خال اور ٹھگنے قد کو دیکھ کر غلط رائے قائم کی۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ اس چھوٹے قد کے اندر کتنی بڑی صلاحیتیں اور خوبیاں چھپی ہوتی ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ نارمن ایک خوش باش اور جوشیلا پائلٹ ہے لیکن وہ اس کے بالکل برعکس انتہائی سنجیدہ قسم کا نوجوان تھا۔

جن دنوں نارمن اور پالڈ مچی گن یونیورسٹی میں کیمیکل انجینئرنگ کا طالب علم تھا، جنگ زوروں پر تھی اور آئے دن فضائیہ میں بھرتی کے لیے اخباروں میں بڑے بڑے اشتہار چھپتے رہتے تھے۔ ایک روز نارمن نے ایسا ہی اشتہار پڑھا اور بطور ایک پائلٹ بننے کا ارادہ کر لیا۔ اخباروں میں ہوابازوں کے کارنامے چھپتے تو وہ انھیں بڑے شوق سے پڑھتا۔ آہستہ آہستہ اس کی آتش شوق بھڑکنے لگی اور ایک روز وہ چپکے سے فضائیہ میں بھرتی ہو گیا۔ ٹریننگ لینے کے بعد اس نے کئی فضائی مہموں میں حصہ لیا اور محاذ جنگ سے واپس آ گیا۔ اب اس کے حوصلے، تدبر اور ہمت، درجہ کمال پر پہنچ چکی تھی اور یہی وجہ تھی کہ ایک روز اسے بن غازی پر حملہ کرنے کے لیے منتخب کیا گیا۔

منصوبہ بندی کرنے کے بعد [illegible] اپنی غیر معمولی صلاحیتوں، دور اندیشی اور جنگی تدابیر کے باعث کرنل میک گوائر کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ کرنل سمجھتا تھا کہ نارمن کے اندر انتہائی خوبیاں موجود ہیں۔ اُن ہی دنوں رائل ایئر فورس کے دو سکواڈرن طیاروں نے بن غازی پر جب حملہ کیا، اتحادیوں کے ونگ میں طیارے روشنی کے بم پھینک رہے، پھینک کر اپنی فضائیہ کی رہنمائی کر رہے تھے لیکن اس زبردست حملے کو جرمن طیارہ شکن توپوں نے بُری طرح ناکام بنا دیا۔ رائل ایئر فورس کے طیارے اپنے بہت سے بم مصنوعی بن غازی پر پھینک کر واپس آ گئے۔ اس کے بعد دوبارہ اتحادی طیاروں نے بن غازی پر حملا کی کوشش کی اور اس مرتبہ بھی بہت سے طیارے ضائع کرنے کے بعد یہ مشن ناکام لوٹ آیا۔ اس مشن کی ناکامی کا جب نارمن کو علم ہوا تو وہ فوراً کرنل میک گوائر کے سامنے پیش ہوا اور کہنے لگا:

"جناب! میں نے سُنا ہے کہ کل رات ہمارا ایئر فورس ناکام ہو گیا ہے؟"

"ہاں" کرنل نے پریشانی سے کہا "ہمارے طیارے بن غازی سے دس میل شمال کی جانب بمباری کرنے کے بعد ناکام آئے ہیں اور گزشتہ دو برس سے یہی ہو رہا ہے۔ آخر کب تک ہوتا رہے گا"

بظاہر ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ کے لیے یہ سوال غیر متوقع لیکن نارمن قدرے سنبھلا اور دائیں جانب دیوار پر لگے ہوئے افریقہ محاذوں کے نقشے کے قریب جا کھڑا ہوا اور دیر تک اسے دیکھتا کمرے میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ کرنل اپنی کرسی پر بیٹھا خاموشی سے کاغذات اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ دفعتہً نارمن نے کہا:

"جناب! اگر مجھے موقع دیا جائے تو میں اصل بن غازی شہر اور بندرگاہ پر بمباری کر سکتا ہوں۔"

کرنل نے اپنے کاغذات نہایت اطمینان سے فائل میں رکھ اور نارمن کو گھورنے لگا:

اس مشن میں بڑے بڑے تجربہ کار اور نڈر پائلٹ کام آ چکے ہیں۔ تم کس طرح کامیاب ہو سکتے ہو؟"

"میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے۔ بشرطیکہ آپ اُسے پسند کریں...... نارمن نے جواب دیا۔

"کہو میں سُن رہا ہوں۔"

"جناب بات در اصل یہ ہے کہ ہمیں پہلے اصلی بن غازی کو

غ لگانا ہوگا۔ اس کے بعد تجویز یہ ہے کہ حملے کے دوران میں ۲۵ ہزار ی بلندی سے بم پھینکے جائیں۔ جرمن ہمیں دھوکہ دینے کے لیے فوراً نوعی شہر کو روشن کر دیں گے۔ اس طرح پہلے راؤنڈ میں ہم اس مصنوعی کے متعلق جان جائیں گے اور دوسرے راؤنڈ میں ہم اس مصنوعی کو نظر انداز کر دیں گے۔"

"دوسرا راؤنڈ؟" کرنل نے حیرت سے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

"جی ہاں، دوسرا راؤنڈ" نارمن نے بیان جاری رکھتے ہوئے ا "پہلے راؤنڈ میں ہم اپنے بم نہیں گرائیں گے، بلکہ مصنوعی شہر کے ردونواح کا جائزہ لیں گے اور دیکھیں گے کہ جرمن طیارہ شکن توپیں ان کہاں نصب ہیں۔"

کرنل میک گواتر نے دلچسپی اور حیرانی کے ملے جلے جذبات اظہار کرتے ہوئے کہا "یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم دوسرے ونڈ میں اصل بن غازی شہر اور بندرگاہ پر بمباری کرو گے؟"

"نہیں جناب، آپ میرا پروگرام نہیں سمجھے" نارمن نے نفی ں سر ہلایا "دوسرے راؤنڈ میں نازیوں کو یہ احساس ہوگا کہ وہ مصنوعی بن غازی کے ذریعے ہمیں دھوکہ نہیں دے سکے اور ہم صل شہر پر حملہ کرنے والے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اصل شہر میں نصب تمی ہر طیارہ شکن توپ سے ہم پر گولہ باری شروع کر دیں گے۔ اس کے بعد بیس ہزار فیٹ کی بلندی سے ہم بہ آسانی طیارہ شکن توپوں ے فائر دیکھ کر اصل بن غازی شہر اور بندرگاہ کا تعین کر سکیں گے اور یسرے راؤنڈ میں ہم اپنے بم بغیر کسی مشکل کے صحیح نشانوں پر گرا یکھیں گے۔"

کرنل نے چند لمحے نارمن کو غور سے دیکھنے کے بعد کہا "تمہارا مطلب میں سمجھ گیا۔ تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ ایک گروپ بھیجوں اور میرا خیال ہے کہ جہاں تمہاری اور گروپ کی تمام اور ی جانیں ضائع ہوں گی، وہاں چند طیارے بھی ضائع کرنے پڑیں

گے۔ میں تمہیں جتنا بے وقوف سمجھتا تھا، تم اس سے کہیں زیادہ بے وقوف ہو......"

"میں آپ سے کئی طیارے نہیں مانگتا۔ مجھے صرف ایک طیارہ درکار ہے۔ جب میں اصل بن غازی اور بندرگاہ پر بم گرانے میں کامیاب ہو جاؤں گا تو بعد میں آپ اور طیاروں کا دوسرا گروپ بن غازی کی مزید تباہی کے لیے بھیج سکتے ہیں۔"

"اس مشن کا مقصد سوائے خودکشی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا!" کرنل نے میز پر گھونسا مار کر کہا "بن غازی پر ایک راؤنڈ لگانا اور آگ اگلتی ہوئی بے شمار توپوں سے بچ نکلنا ہی ایک معجزہ ہے اور تم کہتے ہو تین راؤنڈ...... ناممکن، قطعی ناممکن۔"

نارمن نے چند توقف کے بعد کہا "جناب مجھے اعتماد ہے کہ میں ناکام نہیں ہوں گا۔ اچھا یہ بتائیے کہ آپ کے ذہن میں کوئی تجویز ہے؟"

کرنل نے کوئی جواب نہ دیا اور جواب ہی کیا دیتا؟ اس کے ذہن میں کوئی تجویز نہ تھی۔ وہ چھت کی طرف گھورتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ نارمن کی تجویز ہر اعتبار سے اچھی ہے لیکن اس میں سراسر خطرہ ہے...... لیکن یہ بات ضرور ہے کہ اگر یہ بے وقوف ایک مرتبہ اپنے مشن میں کامیاب ہو گیا تو اصل بن غازی اور بندرگاہ کو نیست و نابود کرنا مشکل نہ ہوگا...... اس کے بعد کئی اسکواڈرن بم بار بھیجے جا سکتے ہیں...... لیکن...... اگر...... کرنل اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔ اس کا ذہن الجھ گیا تھا۔ آخر اس نے دھیمے لہجے میں کہا:

"کیا تم اس مشن کے لیے اپنے آپ کو رضاکار کی حیثیت سے پیش کر رہے ہو؟"

"جی ہاں ——" نارمن نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کیا تم اس خطرے کو اچھی طرح سمجھتے ہو کہ ناکامی کی صورت

میں جرمن توپیں تمہارے طیارے کے پرخچے اُڑا دیں گی۔"

"ممکن ہے جناب، لیکن خطرہ مول لیے بغیر ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔"

"بہت اچھا، اگر تمہیں اپنے اوپر اعتماد ہے تو ایک بمبار، چھ آدمیوں کا گروپ اور ایمونیشن کا یہ جواضر و کھیل سکتے ہو۔"

نارمن کا چہرہ روشن ہو گیا اور اُس نے کہا "شکریہ کرنل۔"

"لیکن ——" کرنل نے فوراً کہا "تم آج رات ہی اس مشن پہ جاؤ گے اور تمہیں ایک پُرانا ۲۴ بی بمبار طیارہ ملے گا۔"

"اوہ، تو آپ نیا طیارہ ضائع نہیں کرنا چاہتے۔" نارمن نے مُسکرا کر کہا اور باہر جانے کے لیے مُڑا۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے اور نارمن کا پُرانا بمبار طیارہ کافی بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ تجویز کے مطابق وہ بن غازی شہر پر دو راؤنڈ لگا چکا تھا اور اب تیسرے اور آخری راؤنڈ کی باری تھی۔ جرمن لڑاکا طیارے ایم ای ۱۰۹ چاروں طرف سے گھیرا ڈال چکے تھے اور مسلسل فائرنگ کر رہے تھے، لیکن نارمن نہایت سکون سے ڈاول پر نظریں جمائے ۲۴ بی کو تیسرے راؤنڈ کے لیے بن غازی کی طرف لے جا رہا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ جرمن سپاہی "مصنوعی شہر" میں بار بار روشنی کر رہے ہیں، مگر اب وہ ان کے فریب میں نہیں آسکتا تھا۔ جرمن اصل شہر اور بندرگاہ کو چھپانے میں ناکام ہو چکے تھے۔

"اسکرین پر ...... اسکرین پر ......" بائیں ونگ پر موجود مشین گن آپریٹر دفعتہً چِلّایا۔ نارمن نے سکرین کو غور سے دیکھا۔ باہر آسمان سیاہ نہیں تھا، بلکہ سُرخ، قرمزی اور نارنجی روشنیاں تیزی سے پھیل رہی تھیں۔ توپوں کے گولے فضا میں طیارے کے آس پاس پھٹ رہے تھے۔ ایک کے بعد دُوسرا گولہ اس تسلسل سے آ رہا تھا کہ ۲۴ بی کے گرد نارنجی روشنی کا ایک ہالہ سا بن گیا تھا۔

"ہم کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔" نیوی گیٹر نے مائیک پر کہا، "ہمارے بچ نکلنے کا کوئی امکان نہیں۔"

"پھر وہی بکواس۔" نارمن نے جھلّا کر جواب دیا، "مجھے یہ بتاؤ کہ جرمن طیارے مجھ سے کتنے فاصلے پر ہیں؟"

"بہت نزدیک ہیں نارمن —— تقریباً ۱۰۵ سو گز —— اور یہ فاصلہ کم ہوتا جا رہا ہے۔"

نارمن نے اپنی دائیں ٹانگ کو سہلایا اور انجن نمبر ایک کے تیل کا دباؤ دیکھا۔ دباؤ اب ٹھیک تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ واپس جانے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کیا وہ خود کو اور اپنے ساتھیوں کو آگ کے اس جہنم میں جھونک دے؟ جرمن طیاروں سے پیچھا چھڑانا آسان کام نہیں .... یک لخت وہ اپنے مائیک پر چیخا:

"فائر کھول دو ——" اور اس حکم کے ساتھ ہی ۲۴ بی کی پانچوں مشین گنوں کے مُنہ کھل گئے اور جرمن طیاروں پر گولیاں برسنے لگیں۔ طیارہ خشک پتّے کی طرح فضا میں کانپتا ہوا پرواز کر رہا تھا۔ چند لمحے بعد نارمن نے جوشیلی آواز میں دُوسرا حکم جاری کیا۔

"فائرنگ بند ...... میں غوطہ لگا رہا ہوں ...... بم گرانے کے لیے تیار رہو۔"

بائیں ونگ کے مشین گن آپریٹر نے کچھ اور سمجھ کر خوشی سے نعرہ لگایا:

"بہت اچھے ...... بہت اچھے ...... اب بھی وقت ہے، واپس مصر بھاگ چلو۔"

یہ سُن کر نارمن کا خون کھول گیا۔ اس نے دل ہی دل میں آپریٹر کو موٹی سی گالی دی اور توپوں سے بچنے کے بجائے پُوری رفتار سے انہی کی طرف غوطہ لگایا۔

"خدا کی پناہ ...... نارمن تم غلط رُخ جا رہے ہو۔" مشین

گن پوائنٹ کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ واپس مڑو ... نارمن!
نارمن کے پاس اب اتنا وقت نہیں تھا کہ جواب دیتا۔ وہ طیارے کو دائیں بائیں رکھنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا جرمن توپیں اب بھی بیس ہزار فیٹ کی بلندی تک گولے برسا رہی تھیں۔ نازیوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اتحادیوں کا طیارہ ایک دم غوطہ لگائے گا۔

"بمباری کرنے کے لیے تیار رہو ہاگن!" نارمن چیخا۔

۲۴- بی نہایت ڈراؤنی آواز پیدا کرتا ہوا تیزی سے زمین کی طرف جا رہا تھا۔

۲۰ ہزار ——— ۱۶ ہزار ——— ۱۴ ہزار ———

۱۲ ہزار ——— اور فوراً ہی جرمن توپچیوں کو احساس ہو گیا کہ دشمن کا طیارہ نیچے آ رہا ہے۔ دوسرے ہی لمحے گولے طیارے کے دائیں بائیں اور اوپر پھٹنے لگے۔

"اصل نشانے سے ہم کتنی دور ہیں؟" نارمن نے پوچھا۔

"تین میل ——— دس ڈگری دائیں جانب مڑو۔"

نارمن نے طیارے کی رفتار دس ہزار فیٹ کی بلندی پر تھوڑی دیر کے لیے کم کر دی تاکہ ہاگن اپنے نشانوں کو دیکھ سکے۔ گولوں کی تیز روشنی میں ہاگن اپنے نشانوں کو اچھی طرح دیکھ چکا تھا جرمن توپیں نشانے بدل بدل کر گولے پھینک رہی تھیں۔ طیارے کے پچھلے حصے میں بیٹھے ہوئے مشین گن آپریٹر مسلسل ایم ای ۹۔ طیاروں کے بارے میں رپورٹ دے رہا تھا۔ اصل نشانہ اب صرف ایک میل دور تھا۔ نارمن نے طیارے کا رخ تین ڈگری دائیں جانب کیا۔ اب وہ ہاگن کی آواز جلد سننے کے لیے مضطرب تھا کہ "بم گرائے جا چکے ہیں۔"

"دائیں طرف ... ایک ڈگری ... ایک ... دائیں ... ٹھیک ... بم گرائے جا چکے ہیں۔"

ہاگن کی آواز جوں ہی نارمن کے کانوں میں گونجی ایک ناقابلِ برداشت مسرت سے اس کا دل اچھلا۔ اسے فوراً محسوس ہوا کہ طیارہ وزن کے بوجھ سے ہلکا ہو چکا ہے۔ اس نے جہاز کا رخ بائیں جانب کیا اور تیزی سے سمندر کی طرف بڑھنے لگا۔ اچانک ایک گولہ طیارے کے کاک پٹ کے نزدیک اس دھماکے اور چمک سے پھٹا کہ ایک لمحے کے لیے نارمن اندھا ہو گیا۔

"طیارہ زخمی ہو گیا ہے" ——— انجینئر کی آواز سنائی دی۔

نارمن کے ہاتھ کنٹرولنگ وہیل پر کانپنے لگے۔ بمبار بڑی تیزی سے زمین کی طرف جا رہا تھا۔ نارمن دیوانہ وار کنٹرولنگ وہیل سے کشتی لڑ رہا تھا جو جام ہو گیا تھا۔ اس کا جسم پسینے سے تر ہو گیا۔ طیارہ اپنا توازن کھو چکا تھا۔ اس نے بدحواس ہو کر ماتحتوں کو منہ کے آگے کرنے کے لیے دایاں ہاتھ بڑھایا تاکہ ساتھیوں کو پیراشوٹ کے ذریعے چھلانگ لگانے کی اجازت دے لیکن جوں ہی کنٹرولنگ وہیل پر ہاتھ کا دباؤ دور ہوا، وہ ایک دم اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ اس نے فوراً طیارے کا توازن ٹھیک کیا۔ دراصل کاک پٹ کے قریب دھماکہ ہونے کے باعث کنٹرولنگ وہیل اپنی جگہ سے ذرا کھسک کر جام ہو گیا تھا۔

"تعمیر کچھ نہیں۔ ہم واپس جا رہے ہیں۔" نارمن نے اعلان کیا۔ اب وہ ڈوویلانڈ کے ساحلی علاقے پر پہنچ چکا تھا اور سمندر کی سطح سے صرف دو سو گز کی بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ نارمن نے سکرین پر دیکھا۔ جن نازی کی بندرگاہ، دھوئیں اور آگ کے شعلوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ صبح چار بج کر ۲۰ منٹ ہوئے تھے کہ ۲۴ بی بمبار واپس امریکی ہوائی اڈے کے جنوب میں افق پر نمودار ہوا۔ چند لمحوں بعد پورے اڈے پر نارمن اور ہالڈ کے مشن کی کامیابی کے چرچے پھیل چکے تھے۔ کرنل میک گوائر حیرت کے عالم میں ان دونوں کو دیکھتا رہا۔ نارمن کو زخمی بمبار طیارے سے نکلتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے نارمن کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہا: "لیفٹیننٹ میں تمہیں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔" ●●

کھانے کھانی

لوفیہ اقبال

نگارنگ خوشنما پھولوں سے لدے پھندے اس کاٹیج کے لمبے برآمدے میں وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے غیر متوقع شخصیتیں تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کے متعلق غلط تاثرات قائم کر رکھے تھے۔ مادام چیلین کسی زاویے سے بھی قاتلہ نظر نہ آتی تھی، نہ ہی انسپکٹر میرڈن پولیس افسر جچتا تھا۔ میرڈن کو سینکڑوں قاتلوں سے واسطہ پڑا تھا اسی طرح مادام چیلین نے بھی بارہا پولیس افسروں کو دیکھا تھا۔ ملاقات سے پیشتر انھوں نے ایک دوسرے کے متعلق جو قیاس آرائیاں کی تھیں، وہ اس دل کش ماحول اور خوش گوار فضا کی وسعتوں میں کہیں گم ہو گئی تھیں اور ان کی جگہ ایک طلسماتی سا تاثر فضا میں رچ بس گیا تھا۔ رنگ و بو، کیف و انبساط، رامش و رنگ میں بسا ہوا تاثر، جس سے انسپکٹر میرڈن کو آج تک واسطہ نہ پڑا تھا۔ اس کی سراغ رساں فطرت کا اکھڑپن اس عطر بیز فضا میں دم توڑتا نظر آتا تھا۔

مادام چیلین پر اپنے دو شوہروں کو ہلاک کر دینے کے الزامات لگائے جا رہے تھے۔ دونوں آدمی معمر اور دولت مند تھے اور دونوں کی موت شادی سے دو سال بعد ہی کسی پراسرار بیماری سے ہوتی تھی۔ پولیس کو شبہ تھا کہ انھیں ہلاک کیا گیا ہے۔ پولیس نے مادام چیلین سے ان کی لاشیں قبروں سے نکلوا کر ان کا معائنہ کرانے کی اجازت طلب کی، لیکن اس نے اجازت نہیں دی۔ اس سے شبہ پختہ ہو گیا۔ قانون کی رو سے پولیس مادام چیلین کی مرضی کے خلاف لاشیں قبروں سے نہیں نکلوا سکتی تھی، کیوں کہ اس کے لیے اس پر قتل کا الزام عائد کرنا اور عدالت سے اس کی اجازت لینی ضروری تھی۔ بالفرض اگر الزام غلط ثابت ہوتا تو پولیس اور حکام کو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ ان پر لاشوں کی بے حرمتی کرنے کا الزام الگ لگتا،



تین قطعات

خودی

ہم نے اقبال کا کہا مانا
اور فاقوں کے ہاتھوں مرتے رہے
جھکنے والوں نے رفعتیں دیکھیں
ہم خودی کو بلند کرتے رہے

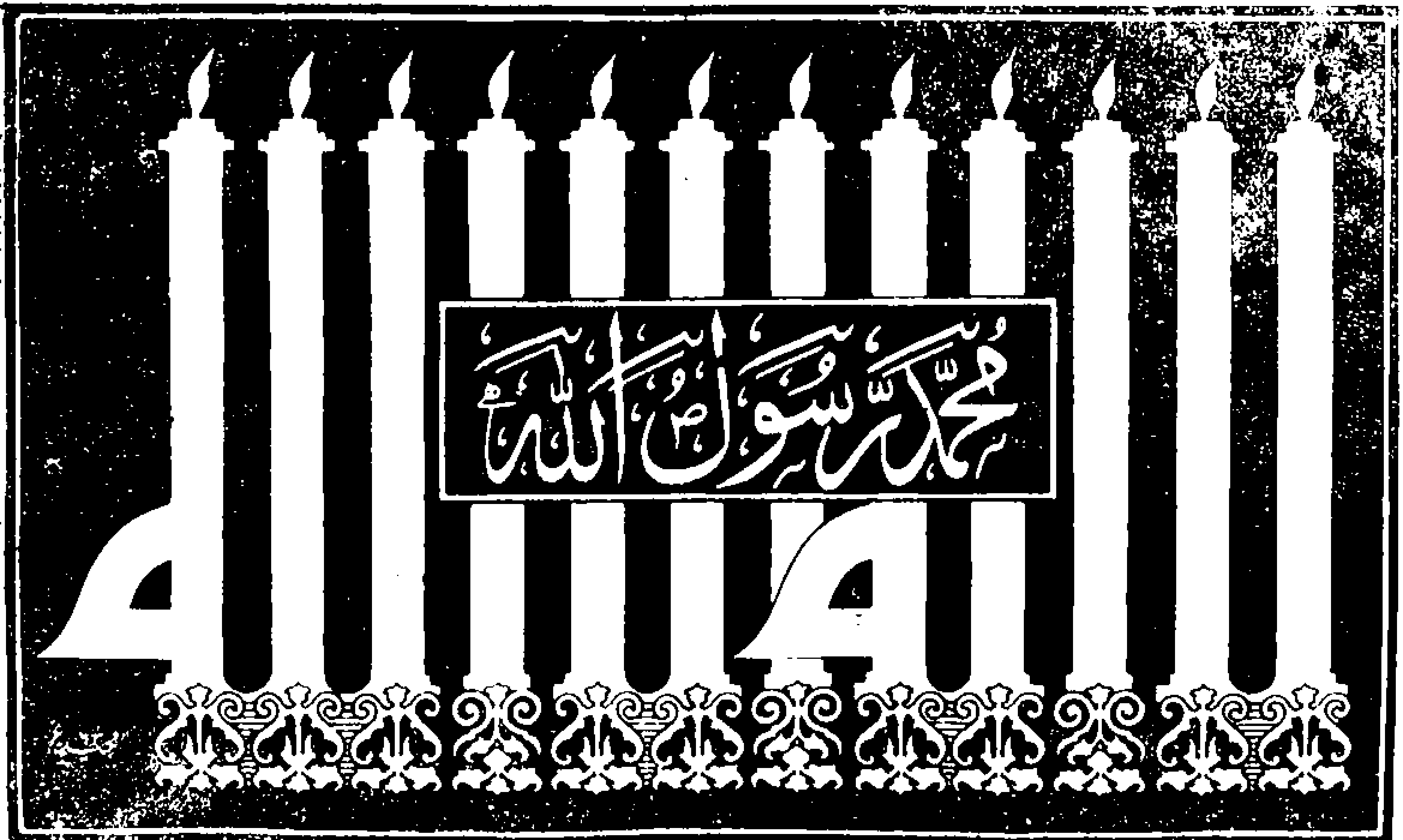
طائرِ لاہوتی

آج ان کی حقیقت کو افسانہ سمجھتے ہیں
کل جن کی فقیری میں مضمر تھی شہنشاہی
اس دور میں ایسے بھی ہیں طائرِ لاہوتی
آتی ہی نہیں جن کی پرواز میں کوتاہی

پردہ

میں نے اک دخترِ حوا سے یہ اک روز کہا
حسن کو اپنے نہ اس طرح سے رسوائی کر
سن کے کہنے لگی اقبال نے فرمایا ہے
پردہ چہرے سے اٹھا انجمن آرائی کر

مرزا محمود سرحدی


محمد رسول اللہ ﷺ

اپنی رائے سے آگاہ کیجیے

ہر مضمون کے دس نمبر ہیں۔ اپنی رائے کے مطابق نمبر لگائیے اور فانوس کو بہتر بنانے میں مدد کیجیے

نمبر شمار	نام مضمون	صفحہ	بہت اچھا ہے ۷ تا ۱۰	پسند آیا ۴ تا ۶	گوارا ۱ تا ۴	شائع کیجیے	مت شائع کیجیے صفر
۱	آفتاب علم و ہدایت	۲۳					
۲	داؤدی بوہرہ جماعت (تاریخ کے آئینے میں)	۱۵۴					
۳	بوہروں کے رسم و رواج	۱۵					
۴	سیدنا کے بارے میں	۲۷					
۵	دختر کشی کی رسم	۱۰۷					
۶	قدیم ترین درخت	۱۳۳					
۷	گلاب	۱۳۷					
۸	پانی	۱۳۵					
۹	انسداد جرائم میں کیمرے کا حصہ	۱۴۷					
۱۰	انسانی گھونسلے	۴۰					
۱۱	کھانے کا فن	۸۰					
۱۲	دلچسپ و عجیب	۹۴					
۱۳	زعفران کے پھول	۵۹					
۱۴	سر کا درد	۱۴۳					
۱۵	اپنے بالوں کی حفاظت کیجیے	۹۷					
۱۶	جنگل کی ایک رات	۴۴					
۱۷	محمد علی کلے	۱۱۹					
۱۸	امریکی بڑے باتونی ہوتے ہیں	۱۳۶					
۱۹	شگوفے	۱۱۷					
۲۰	مصنوعی شہر	۷۱					
۲۱	قطعات	۸۱					
۲۲	نظم	۶۹					
۲۳	غزل	۴۳					
۲۴	ساتواں میل	۶۶					
۲۵	بچوں کو خوب بولنے دیجیے	۱۱۳					
۲۶	ٹک ٹک ٹک	۱۵۹					
۲۷	طوفان کا نقیب	۱۵۲					

لفافے میں ڈال کر مدیر فانوس ڈائجسٹ کلکتہ نمبر ۱۶ کو بھیجیے

خسرو پرویز

دلچسپ حقیقت



اب سے تقریباً ۲۶۰ برس پہلے لمبی اور گھنی داڑھی رکھنے کا رواج روسی عوام میں بہت مقبول تھا۔ روس کے مذہبی رہنماؤں کے نزدیک اس خداداد نعمِ زیبائش کا صفایا کرنا گناہِ کبیرہ تھا۔ چنانچہ اسی خیال کے پیشِ نظر اکثر لوگوں کے چہروں پر داڑھی بڑھتے بڑھتے جھاڑی کی شکل اختیار کر لیتی۔ اسی زمانے میں زار پیٹر (جو تاریخ میں زار پیٹر اعظم کے نام سے مشہور رہے) کے ذہن میں یہ بات آئی کہ تمام روسیوں کی داڑھی کا صفایا کر دیا جائے۔ دراصل مغربی یورپ کے ترقی یافتہ ممالک کے دورے کے وقت وہ وہاں کے داڑھی منڈوں کی دل کش اور پُرکشش شخصیت سے کافی متاثر ہوا تھا۔ ۱۶۹۸ میں جب وہ وطن واپس آیا تو سب سے پہلے امراء میں داڑھی مونڈنے کا پرچار شروع کیا اور بہت جلد اس حد تک کامیابی حاصل کر لی کہ جب زاروں کے سامنے کوئی مجرم پیش کیا جاتا تو سزا کے طور پر اس کی داڑھی کاٹ دی جاتی تھی۔ بعد ازاں پیٹر نے قانون کا سہارا لیکر تمام روسی باشندوں کو داڑھی صاف کر دینے کا حکم دے دیا۔ اس حکم نامے کے تحت ان گنت چہرے داڑھی سے محروم ہو گئے۔ جن روسی باشندوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی ان پر ۲ پنس بطور داڑھی ٹیکس عاید کر دیا گیا۔ امراء کے لئے یہ ٹیکس کچھ زیادہ ہی تھا۔ ان کو سالانہ ایک سو شلنگ داڑھی رکھنے کے لائسنس کے لئے ادا کرنے پڑتے۔ یہ لائسنس ہمہ وقت پالتو کتوں کے پٹے کی طرح ان کے گلے میں لٹکتا رہتا تھا۔

آج کل روس میں صرف مذہبی رہنماؤں کے چہروں پر ہی داڑھی دیکھی جا سکتی ہے۔



رفعت

اپنے بالوں کی حفاظت کیجیے

سر کے بال ہمیشہ انسان خصوصاً عورتوں کی خوبصورتی اور بانکپن کا حصہ رہے ہیں۔ ہر زمانے میں بالوں کو اس وقت کے فیشن اور رواج کے مطابق سنوارا جاتا رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بال چاہے سیاہ ہوں، بھورے ہوں، سنہری ہوں، سیدھے یا گھنگھریالے ہوں، انھیں سجانے، نکھارنے اور سنوارنے کو ہر ایک کا دل چاہتا ہے اور عورتوں میں تو یہ خواہش دیوانگی کی حد تک موجود ہوتی ہے۔

بالوں کی بناوٹ انتہائی پیچیدہ ہوتی ہے۔ تیل بالوں کو چکنا اور ملائم رکھتا ہے، ٹوٹنے سے بچاتا ہے۔ خوبصورتی اور چمک بخشتا ہے۔ سوکھنے سے روکتا ہے اور بالوں کی ہوا اور دھوپ سے حفاظت کرتا ہے۔ گرد وغیرہ کو بالوں کی جڑوں تک پہنچنے سے روکتا ہے۔ مختصر یہ کہ بالوں کی حفاظت اور صحت کے لیے تیل کا استعمال اشد ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی تیل کا اچھا ہونا بھی لازمی ہے۔ خراب تیل بجائے فائدے کے بالوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اس لیے تیل کے انتخاب میں خاص طور سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

مالش بالوں کے لیے سب سے بڑا ٹانک ہے۔ تیل تو سب ہی لگا لیتے ہیں، مگر ٹھیک طرح سے مالش نہیں کرتے، جس سے تیل لگانا یا نہ لگانا برابر ہو جاتا ہے۔ مالش کے بغیر تیل لگانے کا کوئی فائدہ نہیں، لہٰذا تیل لگاتے ہوئے چاہیے کہ آپ اپنے بالوں کی مالش کریں، تاکہ تیل سے صحیح معنی میں فائدہ اٹھا سکیں۔ مالش کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے بالوں کو کھلی ہوا میں کھول دیں اور پھر انگلیوں سے۔ ہتھیلیوں سے نہیں، سر کی کھال کی مالش کریں۔ انگلیوں کو گولائی میں گھمائیں اور سر کے سامنے سے شروع کر کے سر کے پیچھے تک لے جائیں۔ ویسے مالش تو تیل کے بغیر بھی ہو سکتی ہے، لیکن تیل کے ساتھ کی جائے تو اس کا فائدہ دگنا ہو جاتا ہے اور تیل کا بھی صحیح مصرف ہو جاتا ہے۔ انگلیوں کے پوروں کو تیل لگا کر انھیں بالوں میں چلائیے۔ اس سے بالوں کی جڑوں میں خون حرکت کرے گا اور انھیں طاقت ملے گی۔ اس کام کے لیے ہر روز کم سے کم پانچ منٹ ضرور دیں۔ یہ تو تندرست بالوں کی بات ہے کمزور بالوں کے لیے تو آپ کو کم سے کم پندرہ منٹ روزانہ وقت دینے

پڑیں گے۔

بالوں کو کاڑھنے کے لیے کنگھی کا استعمال تو سب ہی کرتے ہیں، لیکن برش کے استعمال اور اس کے فائدوں سے بہت کم لوگ واقف ہیں اور کچھ تو اسے محض فیشن کی ایک چیز سمجھتے ہیں۔ بالوں کی حفاظت کے لیے کنگھی کے ساتھ برش کا استعمال بہت ہی فائدہ مند ہے۔ برش کے استعمال سے بال ٹوٹتے بھی کم ہیں اور ان کی جڑوں میں سے گرد وغیرہ کی بھی بالکل صفائی ہو جاتی ہے۔ لیکن برش کے استعمال سے پہلے بالوں کو کنگھی سے الگ الگ کر لیں تاکہ برش سر کی کھال تک پہنچ کر اپنا کام کر سکے۔ نائلون کا برش استعمال نہ کریں، کیوں کہ اس سے بالوں کے ٹوٹنے کا اندیشہ رہتا ہے۔

کنگھی یا کنگھے کا اچھا ہونا بھی ایک ضروری چیز ہے۔ کنگھی ربڑ کی ہونی چاہیے۔ اس کے دندانے چکنے اور الگ الگ ہوں اور ان کے سرے نوکیلے نہ ہوں۔ سرے نوکیلے ہونے سے سر کی کھال کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ دھات کی بنی ہوئی کنگھی کبھی استعمال نہ کریں۔

برش کے بال کناروں کی نسبت درمیان میں سے اونچے ہونے چاہییں، تاکہ بہ آسانی کھال تک پہنچ سکیں۔ ربڑ کے بنے ہوئے برش بہت دیرپا ہوتے ہیں اور بہت جلد فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اگر ربڑ کا برش دست یاب نہ ہو تو بالوں کا برش استعمال کریں، لیکن تار کے بنے ہوئے برش کو بھول کر بھی استعمال نہ کریں۔

بالوں کو کاڑھتے یا سنوارتے ہوئے، انھیں دو حصوں میں بانٹ لیجیے اور پھر ان میں کنگھی چلائیے۔ ہمیشہ نیچے سے سلجھاتے ہوئے اوپر تک پہنچیے، جب کہ خواتین عموماً اس کے برعکس کرتی ہیں۔ اس سے بال آسانی سے سلجھ بھی جائیں گے اور ٹوٹیں گے بھی کم۔ آپ کو چاہیے کہ دن میں کم از کم دو مرتبہ کنگھی ضرور کریں اور کنگھی کرنے کے بعد برش چلائیں۔ پھر دیکھیے کہ بالوں میں کیسی چمک اور طاقت آتی ہے۔ کنگھی اچھی طرح سر کی کھال تک پہنچنی چاہیے اور اسی طرح برش بھی۔ یہ نہیں کہ کنگھی اور برش اوپر ہی اوپر چلا کر بال سنوار لیے۔ اس طرح تو بالوں میں کنگھی کرنا یا نہ کرنا برابر ہو جاتا ہے۔

کنگھی اور برش کی صفائی بھی بہت ضروری ہے۔ کوئی پرانا ٹوتھ برش (دانتوں کا برش) لے کر کنگھی کے دانتوں میں چلائیں۔ سارا میل آسانی سے نکل آئے گا۔ بعد میں کنگھی کو صابن سے دھونے سے اس کی چکناہٹ دور ہو جائے گی۔ میلی کنگھی سے بال اور بھی گندے ہو جائیں گے۔ برش محض صابن اور پانی سے دھونے سے صاف نہیں ہوگا۔ پانی میں دو چمچے اسپرٹ امونیا ملا کر اس سے دھونے سے برش صاف بھی ہو جائے گا اور اس کی چکناہٹ بھی دور ہو جائے گی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بالوں کو کیسے سنوارا جائے؟ یہ، سو اس کا انحصار بہت کچھ اپنی پسند اور مرضی پر ہے۔ بالوں کا جوڑا بنانا کوئی ضروری چیز نہیں ہے، تاہم جوڑا کرنے سے یہ فائدہ ضرور ہے کہ بال الجھتے کم ہیں۔ بالوں کا بنانا یا سنوارنا بہت کچھ آپ کے چہرے کی بناوٹ پر بھی منحصر ہے۔ ایک چہرے پر ایک طرح کے بال پھبتے ہیں تو دوسرے پر دوسری طرح کے۔ لہٰذا اس سلسلے میں دوسروں کی اندھی تقلید نہ کر کے اپنے چہرے کی ساخت اور بناوٹ کو دھیان میں رکھنا چاہیے اور چہرے کے مطابق ہی بال سنوارنے چاہییں۔

بالوں کی تندرستی اور مضبوطی کے لیے سورج کی کرنوں کا ان کی جڑوں تک پہنچنا اشد ضروری ہے۔ اس سے ان کی خوبصورتی میں نکھار اور رنگ میں گہرا پن آئے گا جو کسی بھی اور طریقے سے

نہیں آسکتا۔ اگر آپ ہر روز دو چار منٹ بھی بالوں کو کھول کر صبح سویرے کی ہلکی دھوپ میں بیٹھیں تو یہ آپ کے لئے بہت سود مند ثابت ہوگا سر دھونے کے بعد تو ضرور ہی دھوپ میں بیٹھ کر بالوں کو سکھائیں۔

بالوں کی تندرستی کے لئے ان کی جڑوں میں ہوا کا پہونچنا بھی نہایت ضروری ہے۔ ہوا نہ لگنے سے پسینے کی وجہ سے بالوں میں ایک خاص قسم کی بدبو پیدا ہو جاتی ہے جو ناقابلِ برداشت ہونے کے ساتھ ساتھ نقصان دہ بھی ہوتی ہے کنگھی کرنے سے پہلے دو چار منٹ کھلی ہوا میں بالوں کو لہرا لینے دیجئے۔

بہت سی خواتین تو بالوں کو کئی کئی ہفتے دھونا ضروری نہیں سمجھتیں۔ ایسی خواتین دانستہ طور پر اپنے بالوں کی تباہی پر کمربستہ ہیں۔ بالوں کی تندرستی کے لئے انھیں دھونا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اور دوسری باتیں۔ زیادہ نہیں تو چار یا پانچ دن میں ایک مرتبہ تو بالوں کو ضرور دھونا چاہئے۔ بالوں کو دھونے کے لئے آملہ، بیسن، دہی اور ارہر کی دال (رات کو بھگو کر صبح پیس کر استعمال کریں) سب سے اچھے ہیں لیکن جن خواتین کا بغیر کسی صابن کے کام ہی نہیں چل سکتا، وہ صرف گلیسرین سوپ یا کوئی اچھا شیمپو ہی استعمال کریں۔

بالوں کو دھونے سے پہلے انہیں تھوڑا گیلا کرلیں، پھر جو چیز لگانا چاہیں، لگا کر آہستہ آہستہ ملیں۔ سر کی کھال کو اچھی طرح مل لیں بھیگنے کے بعد میل پھول جاتا ہے اور انگلیوں سے رگڑنے سے باسانی نکل آتا ہے۔ اگر صابن کا استعمال کیا جائے تو بعد میں بالوں کو بہت اچھی طرح دھولیں، جس سے صابن ان میں رہ نہ سکے۔ تیز گرم پانی سے کبھی بال نہ دھوئیں اس سے بالوں کی جڑیں کمزور ہو جاتی ہیں اور سر کی کھال کو بھی نقصان پہونچتا ہے۔

بالوں کو دھونے کے بعد انہیں صاف روئیں دار تولئے سے اچھی طرح پونچھئے بعد میں ہوا اور دھوپ میں سکھا لیجئے۔ گھنے اور لمبے بالوں کو تولئے سے خاص طور پر پونچھنا چاہئے، ورنہ وہ بہت دیر میں خشک ہوں گے گیلے بالوں میں کبھی کنگھی نہیں کرنی چاہئے بال سوکھ جانے پر موٹے کنگھے سے انہیں سلجھا لیں۔ اور پھر جب بال پوری طرح خشک ہو جائیں تو انھیں بنالیں۔ گیلے گھنگریالے بالوں میں تو ہرگز ہرگز کنگھی نہیں کرنی چاہئے ورنہ آہستہ آہستہ وہ سیدھے ہو جائیں گے اور ان کی انفرادیت اور خصوصیت ختم

ہو جائے گی۔

بالوں کی صفائی کے لئے شیمپو کوئی بہت ہی ضروری چیز نہیں ہے۔ شیمپو کے بغیر بھی بالوں کی صفائی ہو سکتی ہے۔ بالوں میں تھوڑی تھوڑی جگہ پر مانگ نکال کر ملائم کپڑے سے سر کی کھال کو رگڑیئے، اس کے بعد بالوں کی پتلی پتلی لٹیں لیکر بھی ایسا ہی کیجئے۔ اس سے گرد اور چکناہٹ کی بالکل صفائی ہو جائے گی۔

بالوں کی صفائی کا دوسرا طریقہ برش کے استعمال کا ہے۔ برش یا کنگھے میں روئی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پھنسا کر بالوں میں پھیریئے، اور سر کی کھال تک لے جائیے۔ آپ کو یہ دیکھ کر بے انتہا حیرت ہوگی کہ آپ کے سر میں اس قدر گرد اور گندگی کہاں سے آئی۔ پہلے روئی کے ٹکڑوں کو نکال لیجئے اور دوسرے ٹکڑے لگا کر اسی طرح کیجئے، اور اس وقت تک کرتی رہیئے، جب تک کہ آپ کے بال بالکل صاف نہ ہو جائیں۔

مندرجہ بالا باتوں میں آپ کا کچھ وقت تو ضرور خراب ہوگا، لیکن اس وقت کی آپ کو پوری قیمت ملے گی اور کچھ عرصے بعد آپ کا سر گھنے اور لمبے بالوں سے بھر جائیگا ان باتوں سے بال لمبے بھی ہو سکتے ہیں اور گھنے طاقت بھی ملتی ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ رات کے بجائے دن میں اور سردیوں کے بجائے گرمی میں بال زیادہ جلدی بڑھتے ہیں۔ جانوروں کے بال موسم کے مطابق جھڑتے ہیں اور پھر نکل آتے ہیں۔ انسانوں کے ساتھ یہ بات تو نہیں ہے، تاہم ایک خاص وقت پر بلاشبہ کبھی کبھی ان کے بال بھی جھڑتے ہیں۔ جب بال اپنی جڑ سے الگ ہو جاتے ہیں، تو برش یا کنگھی چلانے سے باہر نکل آتے ہیں۔ یہ ایک قدرتی بات ہے۔ ساتھ ہی ساتھ نئے بال بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر نئے بال نکلنے بند ہو جائیں تو ضرور فکر کی بات ہے۔

اکثر بچپن کی بے احتیاطی ہی ان باتوں کی جڑ ہوتی ہے۔ آپ کو چاہئے کہ اپنے بچوں کے بالوں کی دیکھ بھال توجہ سے کریں۔ اس وقت آپ کی ذرا سی لاپروائی آگے چل کر ایک لاینحل مشکل بن جاتی ہے۔

آپ کو چاہئے کہ جھڑے ہوئے بالوں کو سر میں قطعی نہ رہنے دیں، کیونکہ سر ہی میں پڑے رہنے کی صورت میں یہ بال جڑوں کو تباہ کر دیتے ہیں اور انجام کار نئے بال پیدا نہیں ہو سکتے۔

اس حقیقت سے بہرہ ور ہونے کے بعد بالوں کے گرنے سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ اس بات کو نہ

جانے کے باعث اکثر خواتین ڈر کے مارے بالوں کو ٹھیک طرح سے کنگھی نہیں کرتیں اور نہ برش ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ اکثر بال جھڑ جانے کے بعد پھر اتنے گھنے نہیں ہونے پاتے۔

بالوں کو تندرست اور مضبوط رکھنے کا ایک اور بھی طریقہ ہے۔ ایک بالٹی میں نیم گرم اور دوسری میں ٹھنڈا پانی لیں۔ بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کر لیں۔ اس کے بعد بالوں پر پہلے گرم پانی کی دھار ڈالیں اور سر کی کھال کو ملتی رہیں جس سے پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچ سکے۔ پھر اسی طرح ٹھنڈا پانی ڈالیں۔ گرم پانی سر کے مسامات کو کھول دے گا اور خون کھال کے نزدیک آجائے گا۔ ٹھنڈا پانی خون کو دوڑائے گا اور اسی طرح سر میں خون کا دوران ٹھیک ہو جائے گا اور بالوں کی جڑوں کو مضبوطی ملے گی۔ یہ کام آپ ہر روز کریں۔ پھر جب آہستہ آہستہ بال جھڑنا بند ہو جائیں تو کبھی کبھی اور بعد میں تندرست اور مضبوط رکھنے کے لئے جب بھی آپ بال دھوئیں ایسا ہی کریں۔ یہ سب آپ بذات خود ٹھیک طرح نہیں کر سکیں گی کسی دوسرے سے پانی ڈلوائیں اور اپنے آپ بالوں کو الگ الگ کرتی رہیں۔

بالوں کے روکھے پن اور سر کی خشکی کی اصل وجہ آپ کی خوراک ہے۔ لہٰذا آپ کو چاہئے کہ خوراک اچھی اور مقوی کھائیں۔ دودھ اور پھلوں کا استعمال بڑھا کر اور کھٹی، نمکین اور تلا بھنا کھانا چھوڑ کر ہی آپ پورا فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ بالوں کی قدرتی گراوٹ روغنیت کی زیادتی وجہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی ہے پھر بھی ان کو تھوڑی دیر دھوپ اور ہوا میں کھلا رکھئے۔ بالوں کو ٹھنڈے پانی سے دھونے سے بھی حیرت انگیز فائدہ ہوتا ہے۔

سر کی کھال کی صفائی کا اگر پوری طرح دھیان رکھا جائے تو گنج پن پر بھی قابو پایا جا سکتا ہے۔ کھال میں زیتون یا بادام کے تیل کی مالش بہت فائدہ مند ہوتی ہے۔ صابن کو عرق گلاب میں گھول کر اور اس میں تھوڑی اسپرٹ ملا کر بھی بالوں کو دھونے سے فائدہ ہوتا ہے۔ ریٹھی کو بھگو اور پیس کر اس سے بالوں کو دھونے سے بھی نئے بال نکل آتے ہیں۔ بالوں کو گرنے سے روکنے کے لئے ایک دوا بھی ہے جس کا نسخہ حسب ذیل ہے:

ٹنکچر آف کینتھرائڈس	ڈیڑھ آؤنس
ٹنکچر آف کیپسیکم	″ ″
کیسٹر آئل	دو ڈرام
لوون واٹر	ایک آؤنس

ان تمام اشیا کو ملا کر دن میں ایک یا دو مرتبہ سر کی کھال کی مالش کریں۔ دس پندرہ روز میں ہی آپ کو فائدہ معلوم ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی آپ اپنی خوراک میں بھی اصلاح کریں اور دودھ، پھل، اور کچی ترکاریاں زیادہ استعمال کریں تو آپ کے بال ضرور ٹھیک رہیں گے۔

بالوں میں گندگی یا بیماری کی وجہ سے جم جانے والی میل کی پپڑی بھی بہت پریشان کرتی ہے اور بالوں کے گرنے کا ایک سبب بنتی ہے۔ اگر اسے دور کرنے کی آپ کی تمام تراکیب اور مساعی ناکام ہو چکی ہوں تو ذیل میں ایک ویسلین کا نسخہ درج کیا جاتا ہے، اسے استعمال کیجئے۔ فائدے کی امید ہے۔

پریسپیٹیڈ سلفر	ایک ڈرام
گلیسرین	اڑھائی ڈرام
صابن	دس گرین
ڈیٹول	اڑھائی ڈرام
عرق گلاب	دو ڈرام

ان تمام اشیا کے مرکب کو سر دھونے کے بعد سر کی کھال پر ملیں۔ چکنی پپڑی کے لئے "ٹنکچر آف گرین" سب سے بہتر ہوتا ہے۔ ویسے اگر آپ سر کی کھال کی ٹھیک طرح صفائی رکھیں تو آپ کے سر میں نہ میل پیدا ہوگی اور نہ میل کی پپڑی جم سکے گی

بالوں میں تیل لگانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ بالوں میں مانگ نکال کر تیل کو ملیں تاکہ تیل بالوں کی جڑوں تک پہنچ جائے۔ تیل کو اوپر ہی اوپر چپڑنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ آپ ڈراپر سے بھی قطرہ قطرہ کر کے تیل ڈال سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ آج کل تیل کے لئے ایسی شیشیاں بھی ایجاد ہو چکی ہیں اور بازاروں میں عام ملتی ہیں جن میں سے تیل فوارے کی طرح نکلتا ہے۔ ان شیشیوں کے استعمال سے تیل سر کے ہر حصے میں برابر لگتا ہے اور اسے ملنے میں بہت آسانی رہتی ہے لیکن اس میں کپڑوں پر تیل پڑ جانے کا ڈر رہتا ہے۔ گردن کے گرد تولیہ لپیٹ کر آپ انھیں استعمال کر سکتی ہیں۔

بالوں کے لئے سب سے اچھا تیل خالص سرسوں کا ہے۔ اگر آپ اس کی مہک کو برداشت نہیں کر سکتیں تو اسے لگانے کے بعد سر دھو ڈالئے اس کے مسلسل استعمال سے بال سفید نہیں ہو سکتے تل اور ناریل کا تیل بھی سر میں لگانے کیلئے اچھا ہے لیکن آپ کو موجودہ دور کی ان فضول کریموں اور لوشنوں سے بالکل پرہیز کرنا چاہئے۔ اگر آپ انکے بغیر نہ رہ سکیں تو کم از کم انھیں بالوں کی جڑوں تک نہ پہنچنے دیں۔ اوپر ہی اوپر لگا لیں۔ ●

بقیہ صفحہ ۵۰

اور ملزمہ ان پر الٹا مقدمہ دائر کر دیتی۔ ملزمہ سے اقبال جرم کرانا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا، اس لئے جہاں دیدہ، تجربہ کار، فرض شناس اور ذہین انسپکٹر میرون کو خاص طور سے پیرس سے بھیجا گیا تھا۔ وہ اس سے پیشتر کئی کٹھن اور صبر آزما مراحل سے گزر چکا تھا اور سراغ رساں حلقوں میں قابل رشک نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔

مادام چیلن کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اُسے حسین تو کہا نہیں جا سکتا تھا، البتہ اس کے نقوش اچھے تھے اور جسم پُرکشش۔۔۔ انسپکٹر میرون نے سوچا، اس جسم پر دو نوں دولت والے مر مٹے ہوں گے انھوں نے اس پر اپنا سارا مال و متاع لٹا دیا ہوگا اور اب یہ عورت کسی تیسرے کی تلاش میں ہے۔ یہ تو طے شدہ بات ہے کہ یہ عورت عیاش طبع ہے۔ انسپکٹر میرون نے دل ہی دل میں یہ داد تمام کی، کیوں کہ اس عمر میں بھی یہ یہ غضب کا رکھ رکھاؤ کس لئے اور وہ بھی اس سوگوار عورت کے لئے جس نے دو شوہروں کا داغ جھیلا ہو۔ اس خیال سے انسپکٹر میرون کے بدن میں جھرجھری سی پیدا ہو گئی اور اس نے تہیہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو وہ مادام چیلن کے دام فریب میں نہیں آئے گا۔ اس کے جسم کی پکار پر کان نہ دھرے گا اور اپنا سارا تجربہ آج صرف کر کے رہے گا۔

"اطمینان سے بیٹھئے انسپکٹر میرون!" مادام چیلن نے قہوہ پیالی میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر میرون چونک پڑا۔ اس کے خیالات کا تانا بانا ٹوٹ گیا اور وہ سنبھل کر بیٹھ گیا مادام چیلن مسکرا رہی تھی۔ جان دار دلفریب مسکراہٹ۔

"اچھا تو آپ یہ تفتیش کرنا چاہتے ہیں کہ میں نے اپنے شوہروں کو زہر دیا ہے؟" مادام نے قہوے کا گھونٹ لیتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔

"جی۔۔۔" وہ بوکھلا سا گیا۔ "جی نہیں جی ہاں" اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا وہ اس غیر متوقع حملے کے لئے ہرگز تیار نہ تھا لیکن اس کی پیشہ ورانہ مہارت کام آئی اور اس نے دل جمعی سے کہا:

"دیکھئے مادام۔ یہ کہا نہیں جا سکتا کہ آیا آپ کے شوہروں کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے یا وہ اپنی طبعی موت مرے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی زہر آلود خوراک کا شکار

ناؤ سرو اجنٹ

ہو گئے ہوں، بہر حال ہمیں اس کی مکمل چھان بین کرنی ہے۔ آپ نے سارجنٹ لوشیر کو ان کی لاشیں قبر سے نکلوانے کی اجازت نہیں دی، کیوں"

"اس لئے کہ سارجنٹ لوشیر ان لوگوں میں سے ہے جنھیں شرافت چھو کر نہیں گئی ہے وہ آپ سے بالکل مختلف ہے" یہ کہہ کر اس نے انسپکٹر میرون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا۔

"میں آپ کے سامنے انکار نہیں کروں گی انسپکٹر" مادام جیلن نے ایک اور تیر پھینکا۔

"اس عزت افزائی کا شکریہ مادام" انسپکٹر میرون نے کہا "تو کیا یہ سچ ہے کہ آپ کے شوہر موسیو چارلس متوفی جنوری ۶۳ء اور موسیو انتھنی جیلن متوفی مئی ۶۴ء کی اموات کسی پر اسرار بیماری سے ہوئی تھیں ---؟"

"جہاں تک موت کا تعلق ہے، یہ سچ ہے کہ وہ دونوں مر گئے" مادام جیلن نے بڑے سکون سے کہا، "لیکن پر اسرار بیماری والی بات صحیح نہیں"

انسپکٹر میرون اس کی اس جرأت پر انگشت بدنداں رہ گیا۔

"مجھے تو پیرس والوں کا طریقہ معلوم ہے" مادام جیلن نے کہا "تفتیش مکمل کرنی چاہئے مگر اس کے بعد ملزم سے پوچھ گچھ باقی ہے، لہٰذا اب فانوس دراز ...

طے یہ کہنا رہ گیا ہے کہ میرے شوہروں کی موت کس قسم کے زہر سے واقع ہوئی ہے!"

انسپکٹر میرون کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اس نے اپنی زندگی میں ایک سے بڑھ کر ایک مجرم دیکھے تھے اور انہیں ناکوں چنے چبوائے تھے، وہ اس معمولی سی عورت کے ہاتھوں میں زیادہ عرصہ کھلونا بننا ہرگز گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اب اپنا رویہ بدلنا ہی ہوگا۔

"دیکھئے مادام، میں صاف صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کا علم نہیں ہے کہ آپ کے دونوں شوہروں کی موت زہر خورانی سے ہوئی ہے اور آپ نے کون سا زہر استعمال کیا ہے، یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال تو میں آپ سے ان کی لاشیں قبروں سے نکلوانے کے لئے اجازت طلب کرنے آیا ہوں۔ جب لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہوگا تو حقیقت خود بخود سامنے آجائے گی۔ اس وقت آپ کی مدد کی قطعی ضرورت نہیں ہوگی اور......"

مادام ہنس پڑی۔ اس کے موتیوں جیسے دانت چمکنے لگے۔ ہلکے پھلکے قہقہے کی کھنک جل ترنگ بجا گئی۔ انسپکٹر میرون کو یہ سب کچھ بہت بھلا لگا۔ لیکن بہر حال وہ پولیس انسپکٹر تھا، جو کچھ پیش آرہا تھا وہ حقیقت نہ تھی۔

حقیقت تو وہ تھی جسے پیش آنا چاہئے تھا۔

"انسپکٹر میرون"۔ مادام چیلن نے پھر اسے گھورتے ہوئے سکون سے کہا "اگر آپ لاشوں پر تکیہ کریں گے تو آپ کے ہاتھ سوائے غلط انفرنیو کے کچھ نہ لگے گا۔ ہاں اگر آپ مجھ سے تعاون کے طلب گار ہوں تو آپ کو بہت کچھ مل سکتا ہے"

مادام نے آخری الفاظ پر کچھ اس طرح زور دیا کہ انسپکٹر میرون چکرا گیا، تاہم اس نے اپنے حواس پر قابو رکھا اور کاروباری انداز سے بولا:

"کیوں نہیں مادام، آپ کے تعاون کے بغیر تو میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ دیکھئے نا ہو سکتا ہے کہ آپ کے شوہروں کو کسی نے ذاتی دشمنی کی بنا پر زہر دے کر ہلاک کیا ہو تاکہ شک آپ پر کیا جائے اور مقصد اس کا یہی ہو۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اس کے کسی ایسے رشتہ دار کا کام ہو جس کا مقصد ایک تیر سے دو شکار کرنا ہو۔ آپ کی جائیداد اور دولت کی وراثت بھی۔ آپ پھانسی بھی لٹک جائے اور......"

"دیکھئے مسٹر میرون"۔ مادام چیلن نے پہلی مرتبہ انسپکٹر کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ "آپ 'پولیس والا' بننے کی کوشش نہ کیجئے۔ اگر آپ نے عام انسانوں کے سے ہتھکنڈے استعمال کئے تو آپ کو یہاں سے مایوس ہو کر جانا پڑے گا۔ آپ پیرس کے شرفا اور مہذب لوگوں کا سا وطیرہ اختیار کیجئے جس کا مظاہرہ آپ اب تک کرتے رہے ہیں۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ میں نے اپنے دونوں شوہروں کو زہر دے کر ہلاک کیا، لیکن کس طرح؟ اسے آپ کا محکمہ کبھی ثابت نہ کر سکے گا۔ آپ کی سائنس کی بیسویں ترقی بھی کوئی مدد نہیں کر سکے گی"۔ یہ کہہ کر وہ پھر ہنسی اور انسپکٹر میرون پھر لڑکھڑا گیا۔ بڑے سخت مجرم سے واسطہ پڑا ہے۔ اس نے سوچا۔ اگر شکست مان لی تو اس سے بڑی ذلت کی بات اور کوئی نہیں۔

مادام چیلن اپنی جگہ سے اٹھی۔ انسپکٹر نے اس کے دراز قد اور خوبصورت جسم کو للچائی نظروں سے دیکھا اور سوچنے لگا کہ اس عورت کے ہاتھوں ہلاک ہونا بھی خوش قسمتی کی بات ہے۔ پھر وہ جلدی سے منہ پھیر کر باہر پھولوں کے تختے کو دیکھنے لگا۔ مادام چیلن آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی برآمدے کے ستون سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اسے کن انکھیوں سے دیکھتا رہا۔

"انسپکٹر میرون یہاں آئیے"۔ مادام چیلن نے مسکرائے بغیر کہا اور وہ بلا ارادہ چپ چاپ اٹھ کر اس کے قریب چلا گیا۔

"انسپکٹر آپ پیرس کے ان لوگوں میں سے

ہیں، جن کے عادات و خصائل، آداب اور بناؤ کو شائستہ کہا جاتا ہے۔ افسوس کہ میرے دونوں شوہروں میں یہ بات نہیں تھی۔ میں ایک ایسے شخص کے ہاتھوں مرنا زیادہ پسند کروں گی، جو تہذیب و ثقافت کا پیکر ہو۔ لیکن ایسے شخص کی صورت دیکھنے کی روادار نہیں جو اُجڈ، بدتہذیب، بدتمیز اور گنوار ہو۔ پیرس والے بڑے نفاست پسند اور نازک مزاج ہوتے ہیں انسپکٹر۔ اور میں بھی پیرس کی رہنے والی ہوں۔"

مادام جیلن نے یہ کچھ اس درد بھرے لہجے میں کہا کہ انسپکٹر میرون کا دل پسیج گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے خود پر قابو پا لیا۔ وہ اس زہد شکن عورت کے دام میں پھنس کر فرض ناشناسی کا ثبوت نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسے جن لوگوں نے پیرس سے یہاں بھیجا تھا تو سوچ سمجھ کر ہی بھیجا ہوگا۔ مجرم کی پشت پناہی خود سب سے بڑا جرم ہے۔

"تو آپ اقبال جرم کرتی ہیں مادام۔" انسپکٹر میرون نے اس کے بالکل قریب ہو کر کہا۔

"وہ تو میں کر چکی ہوں۔" مادام نے پلٹ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور وہ ٹھٹک گیا۔ "لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ اسے ثابت نہیں کر سکیں گے۔"

انسپکٹر میرون جھلا گیا کیا مصیبت ہے مجرم سامنے ہے، جرم کا اقرار کرتا ہے، لیکن اسے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ آخر کیوں، کیوں ثابت نہیں کیا جا سکتا؟ قریب تھا کہ اس کا پیمانۂ صبر چھلک جاتا اور وہ بالکل پولیس والا بن جاتا کہ ذہانت آڑے آئی۔ اس نے غصہ روک لیا اور میز کے قریب بیٹھ گیا۔

مادام جیلن بھی ڈھیلے ڈھالے قدموں سے اس کے قریب آکر کھڑی ہوئی۔ انسپکٹر میرون لاتعلقی سے خلا میں گھورتا رہا۔ پھولوں کے تختوں سے ہوا کے عطر بیز جھونکے آ رہے تھے، اور فضا میں غنودگی تیر رہی تھی۔

"آپ کھانے کے فن سے بھی واقف ہیں انسپکٹر؟" مادام جیلن نے اچانک پوچھا۔

"کھانے کا فن، کیا مطلب؟" انسپکٹر میرون نے دلچسپی سے کہا

"یہ آپ نے کتابوں میں نہیں پڑھا ہوگا۔ نہ ہی یہ جیل خانے کی سلاخوں کے پیچھے سکھایا جاتا ہے۔ بہرحال میں اس فن کو جانتی ہوں۔" وہ ذرا سی رکی اور کہنے لگی "آپ کو پیرس کے قدیم کھانوں کے نام یاد ہیں؟" یہ کہہ کر اس نے ایک ہی سانس میں کھانوں کے

بقیہ صفحہ ۱۴۱

فضل الرحمن جعفری

دخترکشی کی رسم

نورِ نبوت کے ظہور کے لیے ابھی چند ہی برس باقی تھے کہ فلک کی آنکھ نے بھی و زمین پر یہ منظر دیکھا کہ گلیوں سے ایک عظیم اور پرشکوہ جلوس گزر رہا ہے اور ایک حسین دختر، نو عمر لڑکی سرخ عروسی جوڑا پہنے ایک آراستہ تخت پر جلوہ افروز ہے ۔۔۔ وہ حسن و رعنائی کی دل کش تصویر بنی ہوئی ہے اور لوگ اس تخت کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے چل رہے ہیں ۔۔۔ اس جلوس میں مکے کے نامور، با اثر اور دولت مند لوگ بھی شامل ہیں۔ ان لوگوں میں ہاشمی خاندان کا معروف رئیس ابولہب بھی ہے ۔۔۔ ولید کا بھتیجا ابوجہل بھی ہے ۔۔۔ اس جلوس میں امیر معاویہؓ کا باپ ابوسفیان بھی موجود ہے ۔۔۔ اس میں قبیلۂ سہم کا مشہور سردار عاص بن وائل بھی ہے ۔۔۔ اس میں امیر معاویہؓ کا نانا عتبہ بن ربیعہ بھی شامل ہے ۔۔۔ اس کے علاوہ بے شمار لوگ ہیں جو لات و عزیٰ کو اپنا معبود سمجھتے ہیں ۔۔۔ اور جو اپنے ان پتھر کے بتوں کی حفاظت و نگہبانی کے لیے شمشیر بکف رہتے ہیں۔ ان سب کے درمیان ایک بوڑھا شخص ابن شُعبی ہے جو عرب کا مشہور اور نامور کاہن ہے ۔۔۔ اور اپنے علمی شرف و بلندی کے باعث پورے عرب میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اسی کاہن نے قیس کو اپنی کہانت کے ذریعے یہ بتا دیا تھا کہ مقدس بتوں کو تیری خوبرو لڑکی کی قربانی مطلوب ہے۔ اس نے قیس کو یہ بھی یقین دلا دیا تھا کہ اس قربانی سے تم پر برکتیں نازل ہوں گی اور اس کا سینہ نور سے بھر جائے گا۔ جبکہ کم سن اور نا سمجھ لڑکی اور وہ اس امر سے بالکل بے خبر تھی کہ اس کی منزلِ مقصود کیا ہے۔ اس کی حسین اور معصوم نگاہوں میں طفلانہ تجسس تھا، اور وہ حیران تھی کہ اس کا باپ ۔۔۔ جس کی محبت پر وہ کامل

عقیدہ رکھتی تھی ۔۔۔ اسے یہ بتا دے کہ آخر
اتنے اہتمام سے جلوس نکالنے کا کیا مقصد ہے؟
لیکن قیس نے اسے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا
اور جلوس برابر چلتا رہا۔

عورتوں اور مردوں کے اس ملے جُلے

جلوس میں ایک عورت ایسی بھی تھی کہ جس کا چہرہ
زرد پڑ گیا تھا اور محسوس ہوتا تھا کہ اس کی
رگوں سے خون نچوڑ لیا گیا ہے۔ وہ نیم دیوانگی کے
عالم میں جلوس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ اس
کے پیر لڑکھڑا رہے تھے۔ اور کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ
اس کے سینے میں شعلے بھڑک رہے ہیں جس سے
اس کی ہڈیاں سلگ رہی ہیں۔ یہ عورت قیس
کی بیوی سلمیٰ تھی اور وہ جمیلہ جو قربان گاہ کی
طرف پہنچائی جا رہی تھی، اسی بدنصیب عورت
کی لختِ جگر تھی۔ اس سے پہلے سلمیٰ کی آنکھوں
نے اس کی ایک نہ دو پوری نو (۹) لڑکیوں کو
زندہ دفن کیے جانے کے لرزہ خیز اور جگر فروش
مناظر دیکھے تھے۔ اور اب جمیلہ ہی اس کی امیدوں
کا آخری سہارا رہ گئی تھی، جسے ہبل کا جاں نثار
پجاری قیس آج دفن کرنے کے لیے لے جا
رہا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ قیس نے سلمیٰ
سے کہا تھا آج عرب میں ایک نیا فتنہ اٹھنے والا
ہے جو بڑا ہی مہیب اور دردناک ہوگا اور عرب
کے مشہور و ممتاز کاہن (ابرش) نے یہ اعلان
کیا ہے کہ آنے والے ہولناک اور تباہ کن فتنے
سے نجات پانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ جس
شخص نے اپنی نو لڑکیوں کو ہبل کی قربان گاہ پر
بھینٹ چڑھا دیا ہو وہ اپنی دسویں لڑکی کو
بھی اس کی نذر کر دے۔ اس نے سلمیٰ کی طرف فخر
و مسرت کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا:

اے سلمیٰ! یہ سعادت صرف مجھے حاصل
ہو رہی ہے کہ میں اس عظیم فتنے کے
سدباب کا ذریعہ بن رہا ہوں۔ اس
خیال سے میرے دل میں مسرت کے
چشمے ابل پڑے ہیں۔ اور یہ اعزاز
بطحا ہی میں نہیں، بلکہ پورے جزیرۃ العرب
اور اس نیلگوں آسمان کے نیچے صرف
مجھے حاصل ہو رہا ہے۔ میرا عظمت
و وقار سے ہمیشہ بلند رہے گا۔ شعرا
کی محفلوں میں میرے نام کے قصیدے
پڑھے جائیں گے اور تاریخ میرا
نام لات و ہبل کے سچے پجاریوں اور
فدائیوں میں درج کرے گی۔ پھر
میرے بقیہ لمحاتِ زندگی مسرت و
طمانیت کے ساتھ بسر ہوں گے۔

اے سلمیٰ! میں اس ذلت و رسوائی
سے بھی بچ جاؤں گا، جو گھر میں داماد
آنے کے باعث مجھے برداشت کرنی
پڑے گی۔"

سلمیٰ کے روشن و تابناک چہرے پر غم و اندوہ کی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ اس کے سینے میں طوفان برپا ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں کے کٹوروں سے آنسو چھلکنے لگے تھے۔ قیس نے سلمیٰ کے چہرہ پر غم و الم کی یہ نشانیاں دیکھیں تو وہ سخت غضب ناک ہوا اور قریب تھا کہ اس کے نرم و نازک جسم پر قیس کے غصے کی بجلیاں گرنے لگیں۔ اب سلمیٰ کے ہاتھوں سے صبر و شکیب کا دامن چھوٹ رہا تھا۔ اس نے بے اختیار اپنا سر اپنے سرتاج کے قدموں پر رکھ دیا اور رو رو کر یہ التجا کرنے لگی:

"میرے سرتاج! اتنی بڑی قربانی کی
اہلیت مجھ میں نہیں ہے، اور یہ غم میری
قوتِ برداشت سے باہر ہے ـــ جمیلہ
میری آنکھوں کا نور ـــ اور دل کا
سرور ہے ـــ وہ میری امیدوں
کی واحد جولانگاہ ہے ـــ وہ میری
زندگی کا تنہا سہارا ہے ـــ
وہ میرے ارمانوں کی حسین جنت ہے
فانوسِ دل ہے
ـــ میں اس شاداب جنت کو تاراج
نہیں ہونے دوں گی ـــ میرے آقا!
آپ اسے میرے لئے چھوڑ دیجئے۔ میرے
دل میں صبر کی طاقت نہیں رہی ـــ
میرا جگر پھٹ رہا ہے۔"

سنگ دل قیس پر سلمیٰ کی سسکیوں، التجاؤں اور منتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کی ہر کوشش رائیگاں خالی گئی۔ الٹا قیس اس سے بدگمان ہو گیا۔ اس نے حقارت آمیز لہجے میں زبردستی بچی کی ـــ وہ پھر اس کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں۔

جلوس بڑے وقار کے ساتھ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اور لوگ لات و عزیٰ کی جے کے نعرے بھی بلند کرتے جا رہے تھے۔ اور واقعی عربوں کی عام روایات کے مطابق یہ تقریب بڑی پُر شکوہ تھی۔ اور یہ اعزاز ہر ایک قیس کو حاصل ہو رہا تھا۔ جسے فی الحقیقت لوگ بڑی عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ جلوس میں سازندوں کا ایک سب سے آگے تھا جو ڈھول بجاتے تھے اور نغمے الاپتے تھے۔ ان کے پیچھے ہر طبقے اور ہر عمر کی عورتیں تھیں۔ جو اپنی اپنی حیثیت کے مطابق ریشم و کمخواب کے کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ ان کے جسم پر سونے اور جواہرات کے زیور بھی تھے۔ یہ عورتیں دف

کنکرہ

بجا بجا کر ایسے گیت گا رہی تھیں، جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ ایک پُرمسرت تقریب میں شریک ہیں، اور ایک مقدس فریضہ انجام دینے کی انھیں سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ بُت پرستوں کا یہ گروہ "مکے" کی حدود سے نکل کر تپتے ہوئے ریگستانوں میں پہنچا اور ریت کے بڑے تودے کے قریب جا کر رک گیا۔ اس وقت بجانے والیوں نے ناقوس بجانے شروع کر دئے تھے اور پوری فضا اس کی آواز سے گونج اٹھی تھی ـــــ

اچانک مجمع سے ایک شخص آگے بڑھا اس کی گود میں ایک تین سالہ لڑکی تھی جو بڑی حسین اور معصوم تھی۔ اس شخص نے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"اے عزیزو! آج میں اپنے خاندانی وقار کو قائم رکھنے کی خاطر اپنی بیٹی کو زندہ دفن کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔"

یہ سن کر پورے مجمع سے تحسین کے نعرے بلند ہوتے اور ہزاروں آنکھیں اس انسانیت سوز اور وحشیانہ حرکت کو دیکھنے کے لئے بے چین ہو گئیں۔ اس شخص نے اپنی بیٹی کو زمین پر بٹھا دیا۔ پھر وہ اپنے ہاتھ سے گڑھا کھودنے لگا اس وقت آسمان پر چمکتے ہوئے سورج نے اپنی نصف مسافت طے کر لی تھی اور اس کی حدت سے ریت نے دہکتی ہوئی چنگاریوں کی خاصیت اختیار کر لی تھی، جس کی تپش سے لڑکی کا جسم سلگنے لگا تھا اور وہ بلکنے لگی تھی اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہہ کر اس کے آتشیں رخساروں پر گر رہے تھے اس کا باپ اتنا سفاک وجلاد تھا کہ اس پر اس کی معصوم بیٹی کی دل فگار چیخ کا مطلق اثر نہ ہوا ـــ اور یہ بھی عجیب بات ہے اس بڑے مجمع میں کوئی آنکھ بھی ایسی نہ تھی جو اس دل فگار منظر کو دیکھ کر اشکبار ہوئی ہو۔ لڑکی کے جسم پر آبلے پڑ گئے تھے۔ وہ ایک تڑپ کے ساتھ اٹھی اور اپنے شفیق باپ کے پاؤں سے لپٹ گئی اور اس یقین کے ساتھ کہ انسانوں سے بھرے اس جنگل میں وہی ایک ہے جو اس کے غم کو دور کرنے کی اہلیت رکھتا ہے ـــ لیکن اس کی یہ معصوم تمنا، ایک طفلانہ آرزو ثابت ہوئی۔ اور اس کے باپ نے اسے دھکا دے کر ریت کے دہکتے ہوئے انگاروں پر گرا دیا۔ اس وقت محسوس ہوتا تھا کہ اس کا جسم جل رہا ہے اور وہ آگ کے اس ہولناک انبار میں کروٹیں لے رہی ہے باپ کا دل بیٹی کے لئے فولاد بن چکا تھا۔ اس

کا دل اس کی غم گساری سے یکسر خالی تھا۔
جب بے رحم باپ گڑھا کھود چکا، تو اس نے
کہا:

"اخوان العرب! دیکھو اب میں اپنی
بیٹی کو دفن کر رہا ہوں، تم گواہ رہنا۔"

تمام مشتاق آنکھیں اس قیامت خیز
منظر کو دیکھنے میں مصروف ہو گئیں۔ سنگدل باپ
نے بیٹی کو اپنے قامت کی بلندی تک اٹھایا۔
اور پھر اوندھے منہ گڑھے میں دے مارا اور
بڑی تیزی کے ساتھ اس کے جسم پر گرم گرم ریت
ڈالنے لگا۔ لڑکی تڑپنے لگی۔ وہ پھر معصومانہ
انداز میں چیخ اٹھی۔ اس نے دردناک لہجہ میں
کہا:

"ابا! مجھے بچاؤ، میرا جسم جل رہا ہے
میں ریت میں دبی جا رہی ہوں۔ میرے ابا تم کہاں
ہو، ادھر آؤ۔ مجھے دیکھو، میری مدد کرو۔"

لڑکی کی آنکھوں، اور نتھنوں میں ریگ
کے باریک ذرّے بھر گئے تھے جنہیں وہ اپنے
ننھے ہاتھوں سے صاف کرتی جاتی تھی۔ دیر تک
اس کی جگر خراش آواز اور دل ہلا دینے والی
فریادیں فضا میں پھیلتی رہیں۔ یہاں تک کہ
اب فضا نے بھی اس کی آواز قبول کرنا ترک کر دیا
اور ریت کے عظیم انبار نے اسے اپنے تاریک
آغوش میں دبا لیا۔ اب باپ ایک اہم مذہبی
فریضے سے سبکدوش ہو چکا تھا اور اس کی
روح مسرت و شادمانی سے ہمکنار ہو گئی تھی
اس ہولناک واقعہ کے بعد کئی باپ آگے بڑھے
اور انھوں نے خوش دلی کے ساتھ اپنی اپنی
بیٹیوں کو قبر کی تاریک کوٹھڑیوں میں بند کیا۔ پھر
لوگوں نے دیکھا کہ چند لوگ کدال لے کر آگے
بڑھے اور ان سب نے مل کر ایک طویل و عریض
گڑھا کھودا۔ اس لئے کہ اب عظیم ترین قربانی
دی جا رہی تھی۔ جب قبر تیار ہو گئی تو قیس اس
حال میں منظر عام پر آیا کہ اس کے چہرہ پہ مسرت
و انبساط کی لہر دوڑ رہی تھی ـــ بدنصیب
جمیلہ لڑکیوں کے دفن کئے جانے کا وحشیانہ
منظر دیکھ چکی تھی اور قرائن سے وہ یہ سمجھ
چکی تھی کہ یہ بڑا گڑھا اس کے لئے تیار کیا
جا رہا ہے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی
تھیں اور آنکھیں آنسو بہانے لگی تھیں۔ اس
نے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے اپنے باپ سے
کہا:

"ابا جان! کیا تم مجھے اس گڑھے میں
دفن کرو گے؟"

شقی باپ نے پوری طمانیت سے کہا
"اے جمیلہ! تو نے صحیح اندازہ لگایا ہے، تجھے

شاید معلوم نہیں کہ عرب میں لڑکیوں کے زندہ رہنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور غیور عرب اس ذلت کو برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ ذلت سے بچنے کے لئے لڑکیوں کو یوں ہی دفن کر دیا کرتے ہیں۔"

جمیلہ نے طفلانہ اداؤں کے ساتھ باپ سے بڑی منت سماجت کی اور اس نے یقین دلایا کہ ابا جان! میں آپ کی بڑی خدمت کروں گی آپ کو کبھی ناراض نہیں ہونے دوں گی۔ اور ابا جان! آپ مجھے کھانے پینے کو نہ دیں میں آپ پر بوجھ نہ بنوں گی۔ آپ مجھے زندہ دفن نہ کیجئے یہ کہتے ہوئے وہ جوش محبت میں اپنے باپ کی کمر سے لپٹ گئی، لیکن جلاد باپ کے فولادی قلب پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ قیس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئی تھیں ۔۔۔ اس نے گرج کر کہا:

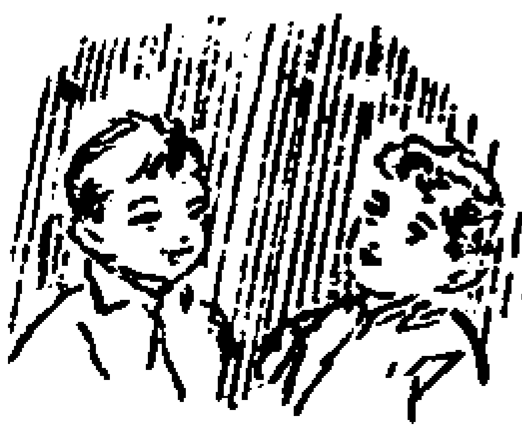
"جمیلہ! تجھے خبر نہیں کہ تیرا وجود میرے لئے باعثِ ننگ و عار ہے۔ کیا تجھے زندہ رکھ کر میں اپنے لئے دائمی ذلت مول لوں؟ تیری زندگی برقرار رکھنے کا مطلب تو یہ ہے کہ تو جوان ہو کر بیاہی جائے ۔۔۔ تیرا کوئی شوہر ہو، جو میرا داماد کہلائے ۔۔۔ کیا تو چاہتی ہے کہ میرا وہ سر جو عزت و عظمت سے ہمیشہ بلند رہا ہے اب تیری وجہ سے جھک جائے اور مجھے لوگ ذلیل و خوار سمجھیں؟"

جمیلہ کے سر پر موت کے بھیانک سائے منڈلا رہے تھے، اس کا پھول سا چہرہ مرجھا گیا تھا ۔۔۔ اس کی آنکھوں کے پیالے آنسوؤں سے خالی ہو گئے تھے ۔۔۔ آخر ایک ساعت ایسی آئی کہ بے درد باپ نے بے بس بیٹی کو اٹھایا اور پوری قوت سے گڑھے میں پٹک دیا اب جمیلہ گہرے غار میں اوندھے منہ پڑی ہوئی تھی۔ اس کی دردناک چیخیں فضا میں بجلی کی طرح پھیل گئی تھیں۔ ادھر قیس کے دونوں ہاتھ جمیلہ کے جسم پر ریت پھینکنے میں مصروف تھے، جمیلہ پوری قوت سے موت سے جنگ کر رہی تھی، وہ ریت اپنے جسم سے ہٹا رہی تھی، لیکن اس کے نازک دست و بازو سنگدل باپ کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اور جمیلہ دفن ہو کر رہ گئی۔

بطحا سے کئی میل دور، قیس کی دسویں اور آخری لڑکی ۔۔۔ جو گلاب کا نیم شگفتہ پھول تھی ۔۔۔ جس کی ادائیں دلربا تھیں ۔۔۔ جس کے وجود سے قیس کے گھر کی زینت تھی اور جو صحت مند و توانا تھی، اب ریت میں دفن کی جا چکی تھی ۔۔۔ یہ تھا زمانہ حجاز کا

بقیہ صفحہ ۱۳۲

ادارہ



بچوں کو خوب بولنے دیجیے

گھر میں سیاست، معاشیات یا کسی اور سنجیدہ موضوع پر زور دار بحث چل رہی ہے۔ مضبوط دلائل پیش کیے جا رہے ہیں، اتنے میں گھر کا کوئی بچہ وہاں آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بس اس کا آنا سب کو ناگوار گزرے گا فوراً کہا جائے گا "صاحب زادے! آپ ذرا تشریف لے جائیے!"

لیکن یہ تو کوئی انتہائی روایتی قسم کے بزرگ ہیں گے، ورنہ اچھے بھلے گھرانوں میں دیکھا گیا ہے کہ وہاں بچوں سے خطاب کے وقت گفتگو کے سلیقے کو سرے سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ گفتگو کا "مہذب" طریقہ بچے کے لیے نہیں ہے، انہیں تو جس طرح بھی مخاطب کیا جائے، وہی ٹھیک ہے لیکن کبھی سنجیدگی سے کسی نے یہ بھی سوچا کہ جو طرز گفتگو بچوں کے ساتھ روا رکھا گیا ہے، وہ ان کی آئندہ زندگی پر کتنا اثر انداز ہوگا؟ شائستہ محفلوں میں ہم اپنے لہجے اور تقریر میں نفاست، احتیاط اور ضبط و تحمل کا خاص طور پر مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس وقت جو زبان ہم بولتے ہیں وہ ہمارے عام معیار سے کہیں بہتر ہوتی ہے بچہ وہاں کھڑا رہ کر بہت کچھ سیکھ سکتا ہے، لیکن بچے کی موجودگی ایسے موقعوں پر گوارا نہیں کی جاتی۔

اب اس کے سلسلے میں ان کے علاوہ جو

ہی کیا ہے کہ وہ یا تو گھر کے کسی تنہا گوشے میں
بیٹھ کر بے کار کی باتیں سوچے اور اپنا ذہن
برباد کرے یا گلی ڈنڈا سنبھال کر محلے کے بچوں
کے ساتھ کسی باغ میں چلا جائے، گلیوں اور
سڑکوں پر بلاوجہ گھومتا پھرے۔ سوچئے، بچے کو
"دخل در معقولات" کرنے والا سمجھ کر کس قدر
ضرر اُسے پہونچایا گیا ہے۔

بچوں کے لب و لہجے اور زبان پر بڑوں
کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ اگر انھیں اپنی صحبت سے
دور رکھیں تو وہ اپنے لہجے میں شائستگی اور
شگفتگی اور بول چال میں روانی پیدا نہ کر سکیں گے
ان میں اپنی گفتگو سے کسی کو متاثر کرنے کی صلاحیت
پیدا نہ ہوگی۔ بات چیت کرتے وقت ان میں
خود اعتمادی پیدا نہ ہوگی۔ ایسے بچے کسی سے بھی
مرعوب ہو سکتے ہیں۔ اس کمزوری سے انھیں
طالب علمی کے زمانے میں بھی نقصان پہونچتا ہے
اور بعد کی عملی زندگی میں بھی۔

اگر کوئی بچہ یا نوجوان شگفتہ لہجے میں شائستگی
اور روانی کے ساتھ کسی موضوع پر بول رہا ہے،
تو سننے والے رشتہ متعلق لوگ بھی متاثر ہوئے بغیر
نہیں رہتے۔ وہ فوراً اس کے بارے میں دوسروں
سے پوچھتے ہیں اور اس طرح ان پر اس کی
شخصیت کا اچھا اثر پڑتا ہے۔ اس کے بارے
میں جو رائیں قائم کی جاتی ہیں، وہ عام طور پر
یہ ہوتی ہیں: "بہت قابل بچہ ہے" "کسی اچھے
خاندان کا ہے" "بہت مہذب ہے"۔ لیکن ہم
اپنے رویے سے بچے کو علاحدگی پسند بنا دیں
اور اُسے مجلسی آداب، طرزِ گفتگو، تقریر اور بیان
میں سکون اور تحمل نہ سکھائیں تو یقیناً وہ اپنے
ہم چشموں میں "بدھو" کے خطاب سے پکارا جائے گا
خواہ وہ کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو۔ خود اعتمادی سے
محرومی اور کم اثری کا احساس اُن کی ذہانت کو
گھن لگا دے گا۔ ان کی کسی سے نہ بنے گی۔ وہ
سوسائٹی کے لئے عضوِ معطل بن کر رہ جائیں گے
ان کی زندگی ان کے لئے تکلیف دہ ہو جائے گی
وہ مستقبل کی ترقیوں سے محروم رہیں گے۔

اگر بچوں کو مہذب، ذہین، متین اور
شائستہ بنانا ہے تو انھیں ایسی صحبتوں، محفلوں
اور مباحثوں میں بچوں کی خاموش شمولیت انھیں
زندگی کے مختلف نشیب و فراز سے روشناس
کرائے گی۔ وہ کسی خراب ماحول میں پڑنے سے
بچیں گے اور اپنی زندگی میں نمایاں ترقی حاصل
کرنے کے اہل بن جائیں گے۔

بچوں سے بات چیت کرتے وقت یا ان
کی موجودگی میں گفتگو کے دوران ہمیں اس
بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ ہماری زبان آسان

ہو اور لہجہ صاف ستھرا ۔۔۔ سب سے ضروری یہ ہے کہ چہرے کے نقوش اور اُتار چڑھاؤ میں کوئی بناوٹ نہ ہو۔ گفتگو جس قدر سادگی سے کی جائے بہتر ہے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ بعض لوگ ابھی گفتگو شروع بھی نہیں کرتے کہ آپ کو کوفت ہونے لگتی ہے۔ وہ اپنے چہرے کو اس طرح بناتے ہیں کہ اچھی بھلی شکل بگڑ کر رہ جاتی ہے۔ کوئی بھی اس انداز کو پسند نہ کرے گا۔ بچے کی یہ عادت ماحول ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ بچے کو گھر کے کسی زودتی صورت شخص کی نقل بنا کر بولنے کی عادت پڑ گئی ہو تو سب خوش ہوتے ہیں۔" اوہ! یہ کتنا اچھا لگتا ہے"۔ یاد رکھئے بچے کا تو ہر انداز ہی اچھا لگتا ہے۔ لیکن بڑے ہو کر یہ عادت پختہ ہو کر ان میں کافی دنوں تک رہتی ہے۔ یہ عادت اسکول میں اس کے داخلے اور تعلیم میں مانع رہتی ہے۔ اس کے لہجے اور تلفظ پر اس کا تھوڑا بہت اثر ضرور رہتا ہے۔

ہکلاہٹ بیماری سے بھی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن صرف دس فیصدی ہکلے بچوں کو یہ عادت کسی بیماری کے باعث ملتی ہے، باقی بچے ابتدائی ماحول کے زیر اثر اس "طرز گفتگو" کے عادی ہو جاتے ہیں۔ کچھ بچے لگاتار بیماری، تالو، زبان اور پھیپھڑوں کی کمزوری سے ہکلے ہو جاتے ہیں۔ نوے فی صدی ہکلے بچے ایسے ہوتے ہیں، جو ان ہکلے بچوں کی نقل کر کے ہمیشہ کے لئے ہکلے ہو جاتے ہیں۔ عادت پختہ ہونے پر اس کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔ اگر والدین اس بات کا خیال رکھیں اور عادت پڑنے سے پہلے ہی اُسے چھڑانے کی کوشش کریں تو نوے فی صدی بچے اس پریشان کن آزار سے بچ جائیں۔

گھریلو ماحول اس قدر صاف ستھرا ہونا چاہئے کہ بچہ بدزبانی اور بدکلامی نہ سیکھ سکے اکثر لوگ گھریلو گفتگو میں احتیاط سے کام نہیں لیتے۔ معمولی معمولی باتوں پر بدکلامی پر اتر آتے ہیں۔ چیخ کر بولنا ان کا شعار ہوتا ہے۔ بچوں کے ساتھ ان کا وہی رویہ ہوتا ہے جو دوسرے کے ساتھ ۔۔۔ ایسے لوگوں کے ساتھ رہنے والے بچے اعصابی کمزوری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کے لہجے اور اندازِ گفتگو پر اس کا خراب اثر پڑتا ہے۔ ایک خاص قسم کا الھڑپن ان کے بولنے کے ڈھنگ میں پیدا ہو جاتا ہے وہ بہت مشتعل ہو جاتے ہیں، جس کا اثر ان کے چہرے اور نقوش پر بھی پڑتا ہے۔ ان کے خدوخال بگڑ جاتے ہیں۔ اگر والدین صاف و شستہ زبان اور شائستہ لہجے میں اپنے بچوں سے گفتگو کریں تو بچے بھی وہی لہجہ اور زبان

اختیار کریں گے ۔۔۔ دنیا میں آنے کے بعد بچہ جو پہلی آواز پیدا کرتا ہے وہ ایک کلکاری یا ایک مبہم سی آواز ہوتی ہے، یا ایک سی چیخ سے مشابہ یہ آواز معنوی اعتبار سے کچھ نہیں ہوتی لیکن جب وہ والدین کے ذریعے اپنی اس کلکاری کا جواب پاتا ہے، تب اُن کی غوں غاں اور بڑھ جاتی ہے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب بچہ والدین کی جوابی آواز کی نقل اُتارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُسی وقت اس کا لہجہ بننا شروع ہو جاتا ہے اور بولنے کی صلاحیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس غوں غاں اور فرحت سے بھرپور کلکاری کے ساتھ وہ "ما ما، با با" ایسی آوازیں نکالتا ہے۔ اس موقعہ پر اس کے ماں باپ خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور "ما ما" اور "با با" ایسی آوازوں کو اپنی زبان میں بدلنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں، پھر بچہ بھی ان کی نقل کرتا ہے۔ ہندوستان، پاکستان، یورپ، افریقہ کسی بھی خطّے کا بچہ کیوں نہ ہو، شروع میں وہ ایسی ہی آوازیں پیدا کرتا ہے۔ بعد میں یہی آوازیں ایک زبان کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ اگر ان آوازوں کو معنی نہ پہنائے جائیں اور ان کا جواب نہ دیا جائے تو بچے کے لئے بولنا بڑا مشکل ہو جائے گا۔ وہ بہت دیر میں بولنا سیکھے گا اور اس کی بول چال میں ہمیشہ کے لئے لکنت رہے گی۔ شائستہ لہجہ، صحیح تلفظ اور آسان لفظوں میں بچوں کی اس غوں غاں کو معنی پہنانا بچے کی تقریر کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔

خود اعتمادی گفتگو اور تقریر کی جان ہے۔ اگر بچے کو شروع ہی سے بڑوں کی صحبت میں بیٹھنے دیا جائے اور وہ طریقۂ گفتار سیکھنے لگے تو اس میں خود اعتمادی پیدا ہو گی۔ آسان زبان میں لکھی ہوئی کہانیاں اور تعلیمی تماشے وغیرہ بھی بچوں کی گفتگو اور زبان بہتر بناتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ بچہ آپ کا پرتو ہوتا ہے، آپ اسے جیسا بنائیں گے، ویسا ہی وہ بنے گا ۔۔۔ یاد رہے گفتگو کا سلیقہ بہت بڑا وصف ہے۔

الیاس اعظم

"خاموش!" جج نے غصے سے کہا "عدالت میں اگر کسی نے شور مچایا تو اسے باہر نکال دیا جائے گا۔"

"ہا۔ہا۔ہا" ملزم نے فوراً شور مچا دیا۔



⁂ ⁂ ⁂

ایک سیٹھ بازار اخبار میں تجارتی بھاؤ کا کالم بڑے غور سے دیکھ رہا تھا کہ باہر سیڑھیوں پر سے اس کی بیوی پھسل کر نیچے گر گئی۔ خادمہ نے چلا کر اسے پکارا۔

"جناب آپ کی بیوی نیچے گر گئی ہے۔"

"فوراً بیچ دو" سیٹھ بازار نے گھبراہٹ میں جواب دیا۔

⁂ ⁂ ⁂

ایک شخص پلیٹ فارم پر ٹہلتا جا رہا تھا اس نے ڈبے میں ایک بہت ہی موٹے آدمی کو اکیلے بیٹھا دیکھ کر مزاحاً پوچھا:

"کیا یہ ڈبہ ہاتھی کے بچوں کے لئے مخصوص ہو چکا ہے؟"

"نہیں صاحب!" موٹے آدمی نے جواب دیا۔ "گدھے، کتے سب کے لئے ہے۔۔۔ آپ تشریف لائیے!"



⁂ ⁂ ⁂

شوہر ساری رات غائب رہنے کے بعد

نازو سوڈا الجبرے

علی الصبح گھر آیا تو بیوی نے غصے سے کہا:
"اب صبح پانچ بجے تم کس لئے آئے ہو؟"
"ناشتہ کرنے کے لئے۔۔۔"

٭ ٭ ٭

بیگم صاحبہ (چیختے ہوئے) جتنی تمھاری تنخواہ ہے اس سے زیادہ کے تو تم برتن ہی توڑ دیتی ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا اس کا کیا علاج کیا جائے
خادمہ ۔۔۔ یہی کہ آپ میری تنخواہ میں اضافہ کر دیں۔

٭ ٭ ٭

ان کے ہاں جب پندرہواں بچہ پیدا ہوا تو والدین نے اس کا نام جیمز تجویز کیا چنانچہ ڈاکٹر نے پیدائش کے سرٹیفکٹ پر یہی نام درج کیا اور واپس چلا آیا۔
ایک گھنٹے کے بعد ڈاکٹر کے فون کی گھنٹی بجی۔ بچے کے والد نے ڈاکٹر سے کہا:
"ڈاکٹر صاحب! سرٹیفکٹ پر جیمز تبدیل کر کے جوزف کر دیجئے۔ مجھے ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ جیمز نام کا ایک بچہ ہمارے ہاں پہلے سے موجود ہے۔"

٭ ٭ ٭

"تمھیں یہاں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟" مالک نے پوچھا
"پچیس سال!" بوڑھے اکاؤنٹنٹ نے جواب دیا۔
"خوب! تب تو تم ترقی کے حق دار ہو۔ میں تمھاری میز کھڑکی کے قریب لگوا رہا ہوں کیونکہ تمھیں اب دھوپ کی بڑی ضرورت ہے۔"

٭ ٭ ٭

پہلا: "تم گدھے ہو۔"
دوسرا: "تم گدھے کے باپ ہو۔"
تیسرا: "چلو اچھا ہوا باپ بیٹوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔"

٭ ٭ ٭

فقیر: "صاحب میری مدد کیجئے۔ میرا سامان، بال بچے، روپیہ پیسہ سب کچھ جل گیا"
امیر: "تمھارے پاس مکان کے جلنے کا ثبوت ہے؟"
فقیر: "صاحب تھا تو مگر وہ بھی مکان اور دیگر سامان کے ساتھ جل گیا۔"

٭ ٭ ٭

ڈاکو بنک کے خزانچی کو ایک تنگ کوٹھڑی میں باندھ کر مال لے جانے ہی والے تھے کہ خزانچی نے گڑگڑا کر کہا: "میرے حساب میں ساٹھ ہزار روپے کم ہیں۔ براہ کرم رجسٹر وغیرہ بھی ساتھ لے جایئے۔"

محمد علی کلے

جلال انور

۱۹۶۰ء میں اولمپک کا مقابلہ جیتنے والا ایک ایسا نیگرو نوجوان تھا جو ۶ فٹ ۳ انچ کا آبنوسی دیونظر آتا تھا۔ اس کے پٹھے فولاد کے معلوم ہوتے تھے، وزن ۲۰۵ پونڈ تھا، شعر کہتا تھا حریف کی ہتک کرتا تھا۔ اس پر فقرے کستا تھا اور اپنی شہ زوری کے علاوہ زبان درازی سے بھی اسے کچا کر دیتا تھا۔ یہ سب باتیں تو خیر ٹھیک تھیں لیکن جب اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ وہ باکسنگ کا عالمی اعزاز سونی لسٹن سے چھین لے گا تو لوگ اس کا مذاق اڑانے لگے۔

تماشائی اس میں اس لئے دلچسپی نہیں لیتے تھے کہ وہ اس کی باکسنگ کے شیدائی تھے بلکہ وہ تو درحقیقت اس کے مسخرے پن کی داد دیتے تھے نیگرو نوجوان کاسیس کلے کا سونی لسٹن سے باکسنگ کا عالمی اعزاز چھیننا ان کے نزدیک آسمان سے تارے توڑ کر لانا تھا۔ لسٹن تو مکہ بازی کا وہ چیمپئن تھا جس نے فلائڈ پیٹرسن سے چیمپئن شپ جیتی تھی اور فلائڈ پیٹرسن وہ عظیم مکہ باز تھا جس نے سویڈن کے انگمر جوہانسن کو نیچا دکھا دیا تھا اسی لئے تو وہ امریکیوں کا ہیرو بن گیا تھا۔ بے شک کلے یہ ڈینگیں مار رہا تھا کہ وہ باکسنگ کا عالمی اعزاز حاصل کرنے کا مصمم عزم کر چکا ہے اور وہ اس کے لئے ۱۲ برس سے مکہ بازی کی جان توڑ مشق بھی کر رہا تھا، لیکن یہ بات ماننے کو کوئی بھی تیار نہیں تھا کہ وہ کامیاب مکہ باز ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۳ء میں جب لندن میں کلے کا ہنری کوپر سے مقابلہ ہوا تو لوگ کہتے تھے کہ اب یہ کوپر ہی اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیگا لیکن کلے نے کوپر کو اس شان سے "ناک آوٹ" کیا کہ اسے سنبھلنے بھی نہ دیا۔ اس سے پہلے وہ ڈگلس جونز کو بھی ہرا چکا تھا جو ۲۵ مقابلے جیت چکا تھا اور دنیا بھر کے مکہ بازوں میں تیسرے نمبر پر تھا۔ کلے کی عمر اس وقت صرف بیس برس کی تھی۔ اس نے ڈگلس کو جو اس سے چھ برس بڑا

تھا چوتھے راؤنڈ میں گرالیا۔

۱۹۶۴ء میں کلے نے یہ [illegible] کر دیا کہ میں لسٹن کو [illegible] اپنے قبول اسلام کا اعلان بھی کر دیا اور لسٹن کے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ امریکی عوام اور باکسنگ کے ماہرین نے یہ خیال ظاہر کیا کہ لسٹن سے پٹ کر کلے کا عالمی چیمپین بننے کا سپنا ہمیشہ کے لئے اتر جائے گا۔ اس رائے کی تہہ میں نسلی غرور کے علاوہ مذہبی تعصب بھی کام کر رہا تھا مگر جب میامی میں مقابلہ ہوا تو کلے نے جو اب محمد علی بن چکا تھا، لسٹن کو ساتویں راؤنڈ میں گرالیا۔ مگر کلے کے مخالفین نے اب بھی اس کی برتری تسلیم نہیں کی۔

لسٹن نے اُسے دوبارہ چیلنج کیا۔

سنہ ۱۹۶۵ء میں دونوں کا دوسری مرتبہ مقابلہ ہوا مگر اس کا فیصلہ ایک ہی راؤنڈ میں ہو گیا۔ محمد علی کے ایک ہی مکے سے لسٹن ڈھیر ہو گیا اور محمد علی نے غیظ و غضب کے عالم میں چلّا کر جوش سے کہا: "پیٹرسن کہاں ہے؟" اسے بھی بھیج دو! میں اس کی بھی برتری تمام کر دوں!" فلائیڈ پیٹرسن کو باکسنگ میں بڑا اونچا مقام حاصل تھا۔ وہ ۲۱ برس کی عمر میں دنیا کا سب سے کم عمر ہیوی ویٹ چیمپین تسلیم کر لیا گیا تھا، اس نے ۴۶ مقابلوں میں سے ۴۲ مقابلے جیت رکھے تھے اور باکسنگ سے لاکھوں ڈالر کما لئے تھے۔ امریکی باکسنگ کی تاریخ میں کوئی حبشی مکا باز کبھی اس سے زیادہ مقبول نہیں ہوا تھا۔ لیکن ۲۲ نومبر ۱۹۶۵ کو لاس ویگاس (نیواڈا) میں ۲۲ سالہ محمد علی کلے نے پیٹرسن کو بارہویں راؤنڈ میں اس طرح ناک آؤٹ کیا کہ وہ نیم جان ہو گیا۔

۳۰۰۰ تماشائی مسلسل محمد علی پر آوازے کستے رہے اور پیٹرسن کا حوصلہ بڑھاتے رہے لیکن محمد علی نے تمام وقت پھرتی سے جگہ بدل بدل کر پیٹرسن کے منہ پر اتنے زور زور سے اتنے زیادہ گھونسے مارے کہ وہ سوج کر پھول گیا۔ پیٹرسن تمام وقت جان بچانے کے لئے اِدھر اُدھر پھدکتا رہا۔ اس نے کئی دفعہ مکے چلائے مگر اس کا ہاتھ محمد علی کے جسم تک پہنچ بھی نہ سکا۔ کیونکہ اس کے بازو لمبائی میں کلے کے بازوؤں سے چھوٹے نکلے۔

پہلے راؤنڈ میں کلے پیٹرسن سے صرف کھیلتا رہا۔ دوسرے راؤنڈ میں اس نے حریف کی پٹائی شروع کر دی۔ مکے مار مار کر اسے نیچے گرا لیا اور اس پر جارحانہ انداز سے منڈلاتا رہا یہاں تک کہ پیٹرسن نڈھال ہو گیا۔ تیسرے راؤنڈ میں محمد علی نے بڑے جوش سے

مکے مار مار کر اس کا چہرہ لہولہان کر دیا۔ چوتھے راؤنڈ میں محمد علی نے حریف پر زبانی حملے کر کے اس کی حوصلہ شکنی شروع کر دی اور جب پیٹرسن نے اسے بیک کیا تو وہ اشتعال بیجے کی گرفت میں آگیا۔ ایک مرتبہ اس نے کلے کے قریب آکر وار کرنا چاہا مگر کلے نے اسے بری طرح دھکیلا اور اس کے منہ پر لگاتار وار کیے جن کا وہ جواب تک نہ دے سکا۔ پانچویں راؤنڈ میں کلے پنجوں کے بل کر اور اچھل اچھل کر وار کرتا رہا

کلے		پیٹرسن
۸۲ انچ	ہاتھ کی پہنچ	۷۱ انچ
۲۳	عمر	۳۰
۲۱۰	وزن	۱۹۶
۶ فٹ ۳ انچ	قد	۶ فٹ ۱ انچ
۴۲½ "	سینہ نارمل	۴۱ "
۴۴½ "	سینہ پھلانے پر	۴۳ "
۳۴ "	کمر	۳۱½ "
۱۷½ "	گردن	۱۶½ "
۱۳ "	مٹھی	۱۱½ "
۱۷ "	پنڈلی	۱۶ "
۱۵ "	ٹخنہ	۱۲½ "

چھٹے راؤنڈ میں پیٹرسن نے وار کرنا چاہا تو کلے نے مکے مار مار کر اس کا حوصلہ پست کر دیا اور اپنے گھونسے مار کر اس کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ ساتویں راؤنڈ میں کلے نے پھر اس کے چہرے پر وار کیا۔ آٹھویں راؤنڈ میں پیٹرسن کا پیٹنے ٹیکتے سانس پھول گیا اور وہ اب ہوا میں ہاتھ مارنے لگا۔ ادھر کلے تر و تازہ دم تھا۔ مسلسل گھونسے برساتا رہا جس سے پیٹرسن کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ نویں راؤنڈ میں پیٹرسن کا چہرہ کس نسل کا چکا تھا اور کلے عملاً مقابلہ جیت چکا تھا۔ دسویں راؤنڈ میں اس نے حریف کے بڑے زوردار مکے مارے جبکہ پیٹرسن کے منہ سے زبان ہی نہیں نکلی۔ وہ کلے پر جھپٹا بھی لیکن ہر بار اس کے مکے کھا کر لڑکھڑا گیا۔ گیارہویں راؤنڈ میں پیٹرسن کا حلیہ اتنا زیادہ بگڑ گیا کہ ڈاکٹروں کی مدد لینے کی ضرورت پڑی۔ محمد علی کلے اس وقت بھی تازہ دم تھا۔ اس نے پے درپے وار کر کے پیٹرسن کو بالکل بے بس کر دیا۔ چنانچہ اس پر کپکپی طاری ہو گئی۔ راؤنڈ ختم ہوا تو اس وقت اس کی حالت واقعی قابل رحم تھی۔ سارا جسم لہولہان تھا اور نس نس ٹوٹ چکی تھی۔ بارہویں راؤنڈ میں کلے نے پیٹرسن کو کئی مرتبہ منہ کے بل گرا دیا جس سے

اس کی طاقت جواب دے گئی۔ اس راؤنڈ کے
اٹھارویں سکنڈ پیٹرسن نیم جان ہو چکا تھا۔
ریفری نے یہ حالت دیکھ کر مقابلہ روک دیا۔
پیٹرسن، کلے کے گھونسوں کی بوچھاڑ کے دوران
سوجے ہوئے ہونٹوں سے نحیف آواز میں احتجاج
کرتا رہ گیا، مگر ریفری نے "خونریزی" جاری رہنے
کی اجازت نہ دی۔ آخری راؤنڈ صرف ۲ منٹ
۱۸ سکنڈ تک رہا۔ اس کے اختتام پر محمد علی کلے
نے بڑے جوش سے چیخ کر کہا "اگر کسی اور کے
دل میں مقابلے کا ارمان ہو تو وہ بھی آجائے۔"

سنگِ اسود سے تراشے جسم نے
پھر رکھی اسمائے پاکیزہ کی شان
آدمی کیا، بازوئے پُرجوش سے
ہو یقیں تو ٹوٹ جاتی ہے چٹان

مقابلہ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ
محمد علی کلے ایسے اطمینان اور خود اعتمادی کے
ساتھ مکا بازی کر رہا تھا جیسے اپنے کسی شاگرد
کو باکسنگ کی تربیت دے رہا ہے۔ برطانوی
اخبار "ایوننگ اسٹینڈرڈ" کے نمائندے نے
لکھا ہے "یہ مقابلہ نہیں تھا بلکہ ایسا معلوم ہوتا
تھا جیسے استاد اپنے شاگرد کو سبق دے
رہا ہے۔ یہ تو باکسنگ کا نہیں بلکہ جمنازیم کا سبق
تھا۔" لندن اخبار "ایوننگ نیوز" نے لکھا ہے

پیٹرسن محمد علی کلے کی مار برداشت نہیں کر سکا
چوتھے ہی راؤنڈ میں اس کی کمر کا ایک پٹھا
چڑھ گیا اور وہ ایسا تھیلا سا بن کر رہ گیا
جس پر مکے مارنے کی مشق کی جاتی ہے۔ کلے
نے پیٹرسن کے تقریباً ۴۰ مکے رسید کئے۔ اس
کے لڑنے کا ڈھنگ بڑا عجیب تھا۔ وہ بقول
شخصے "ایک متحرک ٹھکانا" بنا ہوا تھا جس پر
حملہ کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ بظاہر ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ وہ حریف سے دور دور رہ کر اس پر
حملے کر رہا ہے مگر اصل میں اس کے ہاتھ پیٹرسن
کے ہاتھوں سے زیادہ لمبے ہیں اس لئے پیٹرسن
اس تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ اس صورت سے
فائدہ اٹھاتے ہوئے کلے نے پیٹرسن کو تھکایا بھی
اور اس کی جھپٹ کا شکار بنے بغیر اسے اپنی
پیہم ضربوں کا نشانہ بھی بنائے رکھا۔ اس نے
اپنے دائیں ہاتھ کو کہنی پر موڑ کر "ہک" بنا کر بار
بار جو ضربیں لگائیں ان سے پیٹرسن کا چہرہ اور
منہ بری طرح زخمی ہو گئے۔ وہ محمد علی کے مقابلے
میں اس طرح بے بس نظر آرہا تھا جیسے کسی طے شدہ
منصوبے کے مطابق بلا مقاومت مار کھا رہا ہے
مگر اس کی حقیقی وجہ یہ تھی کہ وہ مقابل کے
تیز حرکت کرنے اور مسلسل ضربیں لگانے کا
توڑ ہی نہ کر سکتا تھا۔ محمد علی کے مکے کا دفاع

یہ ہوتا ہے کہ اس کی ضرب سے حریف اچانک گر نہیں پڑتا بلکہ اسے دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں اور وہ بدحواس ہو کر رہ جاتا ہے۔ محمد علی کافی ذہین انسان ہے مگر جب حرکت میں آتا ہے تو ایسی پھرتی دکھاتا ہے جیسے کوئی بہت ہی ہلکا پھلکا آدمی اچھل رہا ہے۔ گھونسوں اور "پنچ" کے وار کے علاوہ وہ مجاہدوں کی طرح رجز خوانی کر کے بھی دشمن کا حوصلہ پست کرتا رہتا ہے۔ کبھی اپنی تعریفیں زیادہ سے زیادہ بلند بانگ الفاظ اور فقروں میں کرتا ہے کبھی مقابل کی کمزوریوں کا حقارت اور تضحیک سے ذکر کرتا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ ریفری کے بار بار منع کرنے کے باوجود اس سے باز نہیں آتا کیونکہ وہ اسے بھی اپنے فنِ حرب کا ایک جزو سمجھتا ہے اور ان تمام حربی ترکیبوں کے ساتھ ساتھ خدا اور رسولؐ پر جو کامل ایمان رکھتا ہے، اس سے بھی ہر لحظہ اکتسابِ قوت کرتا رہتا ہے۔

یوں امریکہ کے کالے مسلمان مکا باز نے اس فلائڈ پیٹرسن کو جو ۳۰ برس کا ایک منجھا ہوا پختہ کار چیمپین ہے، اپنی جسمانی و ایمانی قوت سے مات دے دی۔ امریکہ کی عیسائی دنیا سے "صلیبی فاتح" کی حیثیت میں محمد علی کلے کے مقابلے پر لائی تھی، مگر یہ صلیبی فاتح شکست کھا گیا۔

کلے کی فتح اتنی واضح تھی کہ پیٹرسن کو بھی اپنی شکست تسلیم کرتے ہی بنی۔ اس نے کہا "مسٹر کلے بڑی زبردست صلاحیت کے مالک ہیں مجھے اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ مجھے ایک عظیم مکا باز نے ہرایا ہے۔ میں کوئی عذر یا بہانہ پیش نہیں کروں گا۔ مجھے کلے کے ہاتھوں کھلی شکست ہوئی ہے۔ دنیا کو اس عظیم باکسر کا احترام کرنا چاہیئے۔" پیٹرسن نے یہ بھی کہا کہ "میں اپنے لاکھوں شیدائیوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے اس مقابلے کے لئے کافی محنت سے تیاری کی تھی اور اسے جیتنے کے لئے اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش بھی کی۔ مگر میری تمام محنت اور تیاری دھری رہ گئی۔"

یہ پیٹرسن کا ۳۴ واں مقابلہ تھا مگر یہ اس کی زندگی کا آخری مقابلہ بھی ثابت ہوا۔ کیوں کہ اس نے آئندہ مکا بازی ترک کر دینے کا اعلان کر دیا ہے۔

محمد علی کلے نے اس مقابلے میں اپنی جسمانی و ایمانی قوت کے جوہر دکھا کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ باکسنگ کی دنیا کا بادشاہ ہے لیکن نسلی غرور اور مذہبی تعصب اب بھی اسے عالمی چیمپئن ماننے سے انکار کر رہا ہے۔ جب کلے اسلام

قبول کیا تھا اس وقت عالمی باکسنگ ایسوسی ایشن
نے اُسے چوٹی کے باکسروں کی فہرست سے
خارج کرتے ہوئے یہ شرط عاید کی تھی کہ پیٹرسن
کو گرا کر دکھائے، اس کے بعد ہی اسے عالمی
چمپئن تسلیم کیا جائے گا۔ اب اس نے پیٹرسن
کو نیچا دکھا دیا ہے، پھر بھی اس کے دشمن اس
سے دنیا کا سب سے بڑا مکا باز ماننے کو تیار نہیں
اس کی کامیابی پر خاک ڈالنے کے لئے یہ پروپگنڈہ
کیا جا رہا ہے کہ پیٹرسن بوڑھا ہو چکا ہے، اس
کی کمر میں ایک عرصے سے درد چلا آ رہا ہے اور
چوتھے راؤنڈ میں اس کے گردے میں درد
اُٹھنے لگا تھا۔ اسی لئے کلے اسے گرا لینے میں
کامیاب ہو گیا۔ لیکن ان بہانوں کی ناقابل
انکار تردید خود پیٹرسن کے مندرجہ بالا بیان
سے ہو گئی ہے۔

بہرحال اب عالمی باکسنگ ایسوسی
ایشن نے ارنی ٹیرل کو اپنا عالمی چمپئن نامزد
کیا ہے اور کلے کو چیلنج کیا ہے کہ اسے گرا کر
دکھائے۔ حالانکہ عالمی مکا بازی کے قوانین
کی رُو سے یہ امر نا انصافی ہے۔ ٹیرل ایک
جرائم پیشہ گروہ سے تعلق رکھتا ہے، اور قانون
کی رو سے وہ باکسنگ کے کسی مقابلے میں
شریک نہیں ہو سکتا۔ مگر محمد علی کلے کے متعصب
اور نسل پرست مخالفین مسٹر ٹوڈ کوشش کر رہے
ہیں کہ ٹیرل پر سے یہ قانونی پابندی اٹھ جائے
تاکہ وہ اسے کلے کے مقابلے پر میدان میں اُتار
سکیں، اگر وہ اس میں کامیاب ہو گئے تو یہ
مقابلہ آئندہ مارچ میں ہوگا (اس سے پہلے
پیٹرسن بھی جرائم پیشہ گروہ سے تعلق کی بنا پر
باکسنگ کے مقابلے میں شرکت کے دروازے
قانوناً بند تھے اور لوگوں نے صرف اسے کلے
سے بھڑانے کے لیے کوشش کر کے اس پر سے
قانونی پابندی ہٹوائی تھی)

محمد علی کے خلاف تعصب کا ایک
اور ثبوت یہ ہے کہ مقابلے کے ٹکٹوں کی فروخت
سے تین لاکھ ڈالر کی جو آمدنی ہوئی پولیس نے
یہ رقم یہ کہہ کر ضبط کرنے کی کوشش کی کہ سونی
لسٹن نے استغاثہ دائر کر رکھا ہے جس میں
۵۸ ہزار ڈالر کا مطالبہ اس بنیاد پر کیا گیا
ہے کہ اسے محمد علی کلے سے مقابلہ میں جتنی رقم
ملنی چاہئے تھی وہ ابھی تک نہیں ملی ہے۔ لیکن اب
ویسٹرن باکسرز ایسوسی ایشن نے یہ تسلیم کر لیا
ہے کہ کلے کی اس کامیابی سے امریکہ میں
مکا بازی کو فروغ دینے کا ولولہ بڑھے گا۔
اللہ کے شیر محمد علی کو یقین ہے کہ
دشمنوں کی پھونکوں سے اس کا چراغ کامیابی

نجھ نہیں سکتا جب اخباری نمائندوں نے
اس سے فریزر سے مقابلے کے متعلق
دریافت کیا تو اس نے ہنس کر کہا پیری تو
پیٹرسن سے بھی گھٹیا باکسر ہے میں اس سے
لڑنے کو تیار نہیں!"

نیویارک میں دی ہیرلڈ باکسرز ایسو
سی ایشن کے سالانہ ڈنر کے موقع پر تقریر کرتے
ہوئے محمد علی نے کہہ دیا ہے کہ اب روئے زمین
پر کوئی انسان ایسا موجود نہیں ہے جو مجھے
ہرا سکے۔ اس موقع پر اس نے اپنے مخالفوں
کے منہ پر ایک زوردار لفظی مکا بھی رسید
کیا اس نے کہا:

"جب میں نے سونی لسٹن کو ایک مکے
سے گرا دیا تھا تو بہت لوگوں نے کہا تھا کہ یہ خیانت
کا معاملہ ہے۔ اب میں نے فلائیڈ پیٹرسن کو
بارہویں راؤنڈ میں گرا دیا تو کہہ رہے ہیں
کہ اسے بری طرح مارنا نہیں چاہئے۔ خدا
کے بندو! آخر تم چاہتے کیا ہو! خبر نہیں اب
کے کون سا مرد میدان میرے مقابلے پر آئیگا
لیکن اگر یہی حال رہا تو شاید مجھے مریخ پر جا
کر اپنا کوئی مقابل تلاش کرنا پڑے۔ یہاں کی دنیا
میں تو کوئی ایسا سورما نظر نہیں آتا جو مجھے ہرا سکے"



امریکی بڑے باتونی ہوتے ہیں

خ۔ا۔خ

نازیوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ احساسِ برتری، خودستائشی اور خود بینی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ ہٹلر نے جرمنوں کے ذہن میں برتر نسل ہونے کا جو زعم جاگزیں کرایا تھا اُس کا انجام نہ صرف دنیا نے دیکھ لیا، بلکہ اس کا نتیجہ خود جرمنوں نے بھی بھگت لیا۔ ہٹلر کی اسی ناعاقبت اندیشی کا پروپیگنڈہ کرنے میں امریکی پیش پیش ہیں لیکن اگر خود ان کی عادات وخصائل کا مطالعہ کیا جائے تو جرمنوں پر احساسِ برتری کا محض الزام ہی نظر آتا ہے۔

امریکی "فوق البشریت" کے نشے میں اتنے سرشار ہیں کہ وہ دوسروں کو ذہنی اعتبار سے اپنے برابر نہیں سمجھتے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ ہر کس و ناکس کے سامنے کثرت سے باتیں کرتے ہیں اسی باتونی فطرت کی وجہ سے وہ اکثر احمقانہ حرکتوں اور لغزشوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

اسی قسم کی روداد پولینڈ کے فوجی محکمہ سراغ رسانی کے ایک کرنل موزرٹ نے بیان کی ہے۔ کرنل موزرٹ ۱۹۵۵ء میں واشنگٹن میں اپنے ملک کے سفارت خانے سے وابستہ تھا۔ اس کے الفاظ میں "امریکہ کیلئے بھی بڑا پیارا ملک ہے اور جاسوسوں کے لئے تو جنت ہے"۔

اس نے جو واقعات بیان کئے ہیں ان سے تصدیق ہوتی ہے کہ واقعی امریکہ جاسوسوں کے لئے جنت نشان ہے۔ قدم قدم پر باتونی فوجی اور سول افسر غیر ملکی جاسوسوں کو خوش آمدید کہنے کے لئے مستعد رہتے ہیں اور خوش خلقی،

ملنساری اور صاف گوئی کی سند حاصل کرنے کیلئے ان کے سامنے سب کچھ اگل دینے کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں۔

کرنل موزرٹ کہتا ہے کہ اگر کوئی غیرملکی امریکیوں سے یہ کہے کہ وہ بے حد دوست نواز ہیں اور امریکا ایک عظیم الشان ملک ہے تو وہ بلا دقت ان کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ کرنل نے بھی حربہ آزمایا اور اگرچہ اس کا لب و لہجہ خالص پولینڈ والوں کا تھا امریکیوں نے اسے وہ باتیں بھی بتادیں جنھیں وہ اپنی بیویوں تک سے چھپاتے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ "۱۹۵۶ء میں ایک مرتبہ اپنے رفیق کار کپتان نوسکی کے ساتھ شکاگو جانے والی ایک

> مضمون نگار کرنل موزرٹ پولینڈ کے رہنے والے ہیں اور عرصے تک امریکا میں پولینڈ کے سفارت خانہ سے وابستہ رہے ہیں انھوں نے امریکیوں کی حد سے بڑھی ہوئی شیخی سے خوب فائدہ اٹھایا۔ اور بہت سے اہم فوجی و سیاسی راز حاصل کرکے روس اور پولینڈ کو پہنچائے یہ مضمون جریدہ "لاکھنٹ" سے لیا گیا ہے۔

ٹرین میں سوار ہوا۔ ٹرین چلی تو میری نظر ممتاز شخصیت کے ایک خوش وضع شخص پر پڑی جو میرے قریب ہی کھڑا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔

"تمھارا لب و لہجہ امریکی نہیں ہے" اس نے کہا "تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"میرا وطن تو پولینڈ ہے، لیکن رہتا میں واشنگٹن میں ہوں" میں نے بتایا۔

"یہاں کیا کرتے ہو؟" اس نے پوچھا

"وہی، جو واشنگٹن میں ہر شخص کرتا ہے" میں نے جواب دیا۔ "میں سرکاری ملازم ہوں"

"خوب! کیا حسن اتفاق ہے؟" اجنبی نے کہا "میں سائنسداں ہوں اور ایک سرکاری تحقیقی محکمے سے منسلک ہوں"

"یہ تو بڑی دلچسپ بات ہے" میں نے کہا اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا، گویا میرے لئے یہ کوئی خاص بات نہ تھی۔ اسی وقت اس نے مجھے اپنے کمپارٹمنٹ میں چل کر گپ شپ لڑانے کی دعوت دی۔ بھلا مجھے کیا عذر ہو سکتا تھا؟ کمپارٹمنٹ میں پہنچ کر میرے اجنبی دوست نے ایک چرمی بیگ اٹھایا اور فخریہ انداز میں بولا

"یہ ہے وہ منصوبہ، جس پر میں آج کل اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کر رہا ہوں۔" اس نے بیگ کھولا اور اس میں سے چند کاغذ نکال کر میرے سامنے پھیلا دیئے۔ ان پر کسی منصوبے کے خاکے بنے ہوئے تھے۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے آپ لوگ کوئی نیا طیارہ بنا رہے ہیں۔" میں نے ٹوہ لگائی۔

"نہیں، یہ منصوبہ ایک نئی فضائی سرنگ کا ہے۔" میرے امریکی دوست نے گردن ہلا کر کہا اور میں چونک پڑا۔

فضائی سرنگ ـــ مجھے یقین تھا کہ ماسکو اور واشنگٹن دونوں کو اس سے دلچسپی ہوگی۔ نہ جانے فضائی سرنگ سے کیا کام لیا جاتا ہے؟ بہرحال میرے احساسِ فرض نے مجھے کچوکا دیا اور میں چوکنا ہو گیا۔ وہ مجھے اس منصوبے کے متعلق بتاتا رہا، جس میں اس کی اپنی کارکردگی نظر آتی تھی۔ اس کی گفتگو سے کم از کم یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اگر وہ اس منصوبے پر کام نہ کرتا تو امریکا اس مرحلے پر کبھی پہونچ ہی نہ سکتا تھا۔

اس دوران میں بیرے نے کھانے کے وقت کی خبر دی اور یکایک میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ "چلیے، میں دو منٹ میں حاضر ہوتا ہوں۔" میں نے کہا اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اپنے اپارٹمنٹ کی طرف لپکا۔ جلدی سے میں نے اپنے ساتھی کپتان نوسکی کو ہدایات دیں کہ وہ میرے اجنبی دوست کے اپارٹمنٹ میں جا کر چرمی بیگ میں جتنے کاغذ ہیں، ان سب کی تصویریں اتار لے۔ اس کے بعد میں تیز تیز قدموں سے کھانے کے کمرے میں چلا گیا، جہاں میرے کرم فرما میرا انتظار کر رہے تھے۔ کھانے کے بعد ہم تقریباً دو گھنٹے تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، حتیٰ کہ میرے دوست کو نیند آنے لگی۔ ہم اٹھے اور اپنے اپنے اپارٹمنٹ میں چلے گئے۔ کپتان نوسکی سو رہا تھا، میرے قدموں کی آہٹ سے جاگ گیا، پھر اس نے تمام کاغذوں کی تصویریں میرے سامنے رکھ دیں۔ اگلے روز یہ تصاویر ماسکو بھیج دی گئیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان تصویروں نے بڑا کام دیا۔ امریکی فضائیہ بلاشبہ ایک نئی ساخت کا طیارہ بنا رہی تھی، جسے صیغۂ راز میں رکھا جا رہا تھا۔ لیکن میرے اجنبی ہمسفر امریکی کی مدد سے یہ منصوبہ روس اور پولینڈ دونوں کو معلوم ہو گیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ میں نیویارک سے واشنگٹن جا رہا تھا جب ٹرین ٹرینٹن اسٹیشن پر پہنچی تو اس میں ایک نوجوان فوجی افسر سوار ہوا۔ وہ میرے قریب ہی آ بیٹھا اور ایک رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس کی وردی پر لگے ہوئے نشانوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بری فوج کے اسلحہ خانے سے تعلق رکھتا ہے۔ میں بے نیازی سے منہ پھیرے کھڑکی میں لگے شیشے پر اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مطالعے سے اکتا گیا تو میں نے فوراً اسے سگریٹ پیش کیا۔ اس نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور سگریٹ لے کر ہونٹوں میں دبا لیا۔

"میں واشنگٹن جا رہا ہوں" حسب توقع گفتگو میں پہل اس نے کی، "آپ کہاں جائیں گے؟"

"میں بھی وہیں جا رہا ہوں" میں نے کہا اور ہمارے مابین تکلف کی معمولی سی دیوار بھی ٹوٹ گئی۔

"آپ غالباً اسلحہ خانہ میں ہیں۔ آپ کا کام بڑا دلچسپ ہوگا؟" میں نے وار کیا۔

"یقیناً!" اس کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو گیا۔ "ہم ان دنوں ایک نیا تجربہ کر رہے ہیں"

اس کی زبان کھل گئی۔ اس نے بتایا کہ کس طرح نئے ٹینکوں پر اس زاویے سے لوہے اور فولاد کی چادریں چڑھانے کا تجربہ کیا جا رہا ہے تاکہ دشمن کے گولے ان پر سے پھسل جائیں۔ وہ دیر تک مجھے سمجھاتا رہا کہ یہ منصوبہ کس طرح کامیاب ہو سکتا ہے۔ پھر یکایک اس نے پوچھا "آپ نے غالباً ایم-۱۴ رائفل کے متعلق سنا ہوگا؟" ایم ۱۴ رائفل میرے لئے نئی چیز تھی۔ میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ بولا "یہ بڑی خطرناک رائفل ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے ایک منٹ میں سات سو راؤنڈ چلائے جا سکیں گے۔ یہ رفتار مشین گن سے بھی زیادہ ہے۔"

"کیا آپ ایسی کوئی رائفل تیار کر رہے ہیں؟" میں نے اپنا استعجاب چھپا کر پوچھا۔

"امید ہے عنقریب تیار ہو جائے گی" نوجوان افسر نے بتایا۔

ہمارا سفر ختم ہو گیا اور ہمارا ہم سفر بھی گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر رخصت ہوا۔ میں نے فوراً ایک یادداشت مرتب کی اور اسے اپنے سفارت خانے کے ایک

ماہرِ فن اسلحہ سازی کے حوالے کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ امریکی ماہرین ان نئے ٹینکوں اور الفلکی کے تجربے میں ناکام رہے، تاہم مجھے بیٹھے بٹھائے یہ اعزاز حاصل ہو گیا کہ ان کے عزائم سے آگاہ ہونے والا میں پہلا غیر ملکی جاسوس تھا۔ اس کارکردگی کے عوض مجھے اپنی حکومت کی طرف سے ایک سند بھی ملی۔

ایک مرتبہ میں نے اپنے دو ماتحت افسروں میجر کوون اور میجر فلاڈی کو ٹیکساس بھیجا۔ وہاں امریکی فضائیہ کے متعدد اڈے تھے۔ دونوں افسران اڈوں کے قریب ہی ایک ہوٹل میں جا ٹھہرے، جہاں امریکی فضائیہ کے افسران اور عملے کے ارکان آتے جاتے تھے۔ ایک رات وہ ہوٹل کے شراب خانے میں بیٹھے تھے کہ ایک لمبا تڑنگا نوجوان ایک بڑا سا ہیٹ پہنے داخل ہوا۔ دونوں افسروں نے اتنا بڑا ہیٹ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اس لئے وہ حیرت سے اس نوجوان کو دیکھنے لگے۔ نوجوان کی نظر ان پر پڑی تو وہ سیدھا ان کے قریب آیا۔ افسروں نے اپنا تعارف کرایا اور اسے اپنے ساتھ شریک ہونے کی دعوت دی۔

"آپ لوگوں کا ٹیکساس کے متعلق کیا خیال ہے؟" اس نے بیٹھتے ہی پوچھا۔ دونوں افسروں نے ٹیکساس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دئیے۔ اس پر وہ خوشی سے پھولے نہ سمایا:

"دیکھئے، شمال میں جنگ کی تیاری ہو رہی ہے۔" اس نے بڑے مدبرانہ انداز میں کہا، "اور ہم یہاں لڑنے والوں کی مدد کی تیاریاں کر رہے ہیں۔" وہ ہنسا، گویا بڑا لطیف جملہ کہہ دیا ہو۔ "آپ نے ہمارے بڑے بڑے ہوائی اڈے تو دیکھے ہوں گے؟"

"جی نہیں!" دونوں نے بیک زبان کہا۔

"میں ان کے متعلق سب کچھ جانتا ہوں۔" پھر اس نے بتایا کہ وہ امریکی فضائیہ میں چار سال تک پائلٹ رہ چکا ہے اور باپ کے مرنے پر یہ پیشہ چھوڑنے پر مجبور ہوا ہے۔ میرے آدمیوں نے اسے کھانے کی دعوت دی۔ کھانے کے دوران میں اور اس کے بعد اس نے امریکی فضائیہ کے متعلق دل کھول کر انکشافات کئے۔ میجر کوون اور میجر فلاڈی کے بقول وہ تو امریکی فضائیہ کا ایک چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا ثابت ہوا۔ اگرچہ اس کی فراہم کردہ معلومات

کا بیشتر حصہ غیر موزوں تھا، تاہم ہمارے ہاتھ کئی اہم باتیں آئیں۔ سب سے زیادہ اہم بات تو یہ معلوم ہوئی کہ ٹیکساس کے اس ہوائی اڈے سے کتنے بمبار طیارے ہر وقت پرواز کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ایک بمبار میں بیک وقت کتنے بم اور کس وزن کے رکھے جاتے ہیں، راڈار کہاں نصب ہے اور اس کی قوت عمل کتنی ہے۔ بمبار طیاروں کو پرواز سے پہلے کس قسم کی ہدایات دی جاتی ہیں، اور طیاروں کو مار گرانے کا بہترین طریقہ کیا ہے۔ میرے دونوں ماتحت افسروں کو فضائیہ کے متعلق زیادہ معلومات نہ تھیں۔ چنانچہ وہ صحیح رپورٹ مرتب نہ کر سکے میں نے اپنی حکومت کو مطلع کیا کہ آئندہ اس قسم کے مشن کے لئے فضائیہ سے پوری طرح آگاہ، ماہر افسروں کو تعینات کیا جائے۔

ہمارے لئے فوجی نوعیت کی معلومات حاصل کرنے کا ایک بڑا ذریعہ "پینٹاگون" بھی تھا جو بالکل اور یاوہ گو امریکی افسروں کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اس عمارت میں داخل ہونے کے لئے اجازت نامے کی ضرورت نہ تھی، البتہ اس کے کچھ حصے مخصوص تھے، جہاں بلا اجازت داخلے پر پابندی تھی، تاہم کان دھرنے سے کچھ نہ کچھ پتہ چل ہی جاتا تھا۔ اس عمارت میں ڈاکخانہ، ڈاک خانہ، بنک اور آسائش کے دیگر مراکز بھی تھے۔ سب سے زیادہ کارآمد لائبریری تھی جہاں بڑے بڑے افسر نہایت مدبرانہ انداز سے حالات حاضرہ پر تبادلہ خیالات کرتے تھے۔ ہماری توجہ اور دلچسپی کا سب سے بڑا مرکز یہی لائبریری تھی۔ ہمارا کام دو آدمیوں کے درمیان گفتگو کو دھیان سے سننا تھا۔ اس گپ شپ میں سے ہمیں ایک آدھ کام کی بات معلوم ہو ہی جاتی تھی۔ یہیں معلوم ہوا کہ ایک امریکی رجمنٹ ایٹمی جنگ کی خصوصی تربیت حاصل کر رہی ہے ایک کرنل نے اپنے دوست کو بتایا کہ وہ ان دنوں ایک نئے ہتھیار کے استعمال کی تربیت لے رہا ہے جس کا نام اب تک کسی کو نہیں بتایا گیا ہے۔ اسی طرح ایک کرنل نے اپنے دوستوں کو امریکا کے نئے طیارے بی ۔ ۔ کے متعلق بتایا، جسے حال ہی میں تیار کیا گیا تھا اور بیرونی دنیا اس سے اب تک ناواقف تھی۔

پتہ صاف اور
خوش خط لکھیں۔

ادارہ

قدیم ترین درخت

سائنس دانوں نے حال ہی میں چین میں ایک ایسے درخت کا پتہ لگایا ہے جس کے متعلق یہ یقین کیا جاتا تھا کہ وہ اب دنیا میں کہیں موجود نہیں۔ لاکھوں سال پرانی چٹانوں میں اس درخت کے پتوں کے رکاز ملے تھے۔ زمین پر اب سے تین کروڑ سال سے چھ کروڑ سال پہلے تک کچھ بہت عظیم درخت اگتے تھے۔ وہ تو تباہ ہو گئے لیکن ان کی پتیاں چٹانوں میں دب دبا گئیں جن سے ان کے حالات معلوم ہوئے۔ سائنسدانوں کا خیال تھا کہ یہ درخت اب سے دو کروڑ سال پہلے زمین سے نیست و نابود ہو گئے لیکن اب انھوں نے وسطی چین میں ان درختوں کے ایک پورے جنگل کا پتہ لگایا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکا میں "ٹولپ" نامی ایک پھول دار درخت پایا جاتا ہے۔ یہ بھی دنیا کا ایک نہایت قدیم درخت ہے اور آج بھی اسی شکل میں موجود ہے جیسا اب سے لاکھوں برس پہلے تھا۔

دنیا کے سب سے پرانے درخت وہ صنوبر ہیں جو امریکا کے مغربی ساحل پر سیرا نوادا کے پہاڑوں پر ملتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی عمر تین ہزار سال خیال کی جاتی ہے۔ اکثر کی اونچائی تین سو فیٹ کے قریب ہے یعنی کسی بیس منزلہ عمارت کی ہوتی ہے۔ جڑ کے قریب ان کا گھیرا تقریباً سو فیٹ ہوتا ہے۔ سب سے بڑے درخت کے تنے کا وزن ایک ہزار ٹن سے زیادہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ان دیو قامت درختوں کے بیج اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ سات ہزار بیجوں کا وزن صرف ایک اونس یا آدھی چھٹانک ہوتا ہے۔

امریکی حکومت کیلی فورنیا میں پائے جانے والے صنوبروں کی پوری حفاظت کرتی ہے۔ بہت سے لوگ ان درختوں کے جھنڈوں کو دنیا کے عجائبات میں شمار کرتے ہیں۔ کہا جاتا

ہے کہ یہ درخت نہ کسی بیماری کا شکار ہوتے ہیں اور نہ بڑھاپا ہی انھیں ستاتا ہے۔ اگر انھیں کسی چیز سے نقصان پہونچ سکتا ہے تو وہ آسمانی بجلی ہے۔

افریقہ میں ایک نہایت قدیم درخت پایا جاتا ہے، جو وہاں کے لوگوں کے لئے بڑا ہی کارآمد ثابت ہوا ہے۔ اسے "باؤباب" کہتے ہیں اس کی اونچائی تو زیادہ نہیں ہوتی، لیکن تنے کا قطر تیس فیٹ تک پہونچ جاتا ہے۔ اس کی لکڑی نرم ہوتی ہے، اس لئے زیادہ کام نہیں آتی، لیکن اس پر کدو جیسا پھل لگتا ہے، جسے وہاں کے لوگ کھاتے بھی ہیں اور اس سے ایک طرح کی شراب بھی تیار کر رہے ہیں۔ وہ اس کے گودے کو جلا کر مچھروں اور دوسرے کیڑے مکوڑوں کو دور رکھتے ہیں۔

اس درخت کی چھال چمڑا رنگنے کے کام آتی ہے اور اس سے ایک دوا بھی تیار کی جاتی ہے۔ چھال کے ریشے سے رسی، کپڑا، پردے اور گانے بجانے کے آلات کے تار بنائے جاتے ہیں۔ اس کے بیجوں سے گلے کے ہار تیار کئے جاتے ہیں۔ اس درخت کے تنے کو کھود کر اس سے عمدہ کشتیاں تیار کی جاتی ہیں۔ اسی طرح پرانے تنوں کو کھوکھلا کر کے ان سے مکان کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ ہندستان، پاکستان اور شرق الہند میں بڑ کا درخت پایا جاتا ہے۔ دنیا کا کوئی درخت چاروں طرف اتنا نہیں پھیلتا جتنا بڑ پھیلتا ہے۔ جیسے اس کی شاخیں ادھر ادھر بڑھتی ہیں، ان کی جڑیں زمین تک پہنچنے لگتی ہیں جنھیں ہمارے ہاں "بڑ کی داڑھی" کہا جاتا ہے۔ جب یہ جڑیں زمین میں اتر کر موٹی اور مضبوط ہو جاتی ہیں تو ایک جداگانہ درخت کا کام دیتی ہیں۔ ان سے اور شاخیں اور ان شاخوں سے مزید جڑیں پھوٹتی ہیں اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے۔

بڑ کے بعض درخت میں ایک ہزار تنے نکل آتے ہیں اور وہ بہت سی زمین پر چھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سکندر اعظم کے حملے کے وقت ہندستان میں بڑ کا اتنا بڑا درخت موجود تھا کہ اس کی فوج نے اس درخت کے سائے میں آرام کیا تھا۔ فوج میں سات ہزار سپاہی تھے۔

ڈاکٹر محمد نور احمدی فریدی فیروزآباد

پانی

انسانی جسم کو برقرار رکھنے کے لئے

افادیت کے اعتبار سے پہلا درجہ ہوا کا اور دوسرا پانی کا ہے۔ ہمیں اپنی زندگی برقرار اور صحت بحال رکھنے کے لئے جہاں کھلی اور صاف ہوا کی ضرورت ہے وہیں صاف اور عمدہ پانی ضروری ہے۔ آجکل پانی حاصل کرنے کے بہت سے ذرائع اور وسائل ہیں۔ یوں تو سمندروں، دریاؤں، چشموں، تالابوں اور جھیلوں وغیرہ سے پانی صاف کر کے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ لیکن سب سے بہتر بارش کا یا پھر قدرتی برف سے پگھلا ہوا پانی مانا گیا ہے۔ اس کے علاوہ گہرے کنوؤں کا پانی بھی نہایت مناسب ہے!

پانی ہماری روزمرہ ضرورت کا نہایت اہم جز ہے۔ لہٰذا ہمیں اس کی طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اگر بارش کا یا قدرتی برف اور گہرے کنوئیں کا پانی دستیاب نہیں ہوتا تو مصنوعی طریقے سے پانی کو صاف کر کے استعمال کرنا چاہئے۔ سب سے بہتر طریقہ پانی کو ریت اور کوئلہ سے فلٹر کرنے کا ہے۔ صرف پانی کو اُبال کر استعمال کرنا ہی کافی نہیں۔ پانی کو اُبال لینے سے نقصان پہونچانے والے جراثیم تو ہلاک ہو سکتے ہیں لیکن جب تک فلٹر نہ کیا جائے ہم ان کی ان گنت لاشوں کو ہضم نگلنے سے کیسے بچ سکتے ہیں۔

اس بات سے غالباً سب لوگ واقف نہیں کہ انسانی جسم کے اندر تقریباً ۷۰ فی صدی پانی موجود ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ تمام ذی روح مخلوق کی غذا کے اندر بھی کسی نہ کسی مقدار میں پانی ضرور ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ہمیں پانی کی کتنی سخت ضرورت ہے۔ ہندوستان کے بعض علاقوں میں معصوم بچوں کو چھ سات مہینے

تک پانی نہیں دیا جاتا یہ ایک غلط عادت ہے اور اس سے بہت نقصان ہوتا ہے۔ اب دھیرے دھیرے یہ رواج ختم ہوتا جارہا ہے اور بچوں کے لئے پانی کی اہمیت کا احساس ہو چلا ہے۔

پانی ہمارے لئے قدرت کی دی ہوئی ایک عظیم نعمت ہے۔ ہمیں اس کو اس کی اصلی شکل ہی میں استعمال میں لانا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ قدرت نے ہماری ضرورت کے لئے جو انتخاب کیا ہے وہ عین فطرت کے مطابق ہے آج کے سائنسی اور ترقی یافتہ دور میں لوگ اس کا غلط استعمال کر رہے ہیں، مثال کے طور پر کھاری میٹھی، خوشبودار گیس بھری پانی کی بوتلیں، سوڈا واٹرس، منرل واٹرس وغیرہ وغیرہ۔ ان سب چیزوں میں سے کسی ایک کو اگر اتفاقیہ طور پر استعمال کر لیا جائے تو شاید اتنا نقصان نہ پہونچے جتنا کہ اس کے بار بار اور بکثرت استعمال سے پہونچتا ہے۔ ایسی بھری ان بوتلوں کا استعمال کرنے سے معدہ پر غیر طبعی بوجھ پڑتا اور پیٹ خراب ہوجاتا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ چیزیں ہمیں تازہ نہیں مل پاتیں اس طرح باسی ہونے کے سبب ان بوتلوں میں بہت زیادہ تیزابیت یا خمیر پیدا ہوجاتا ہے جس سے معدہ پر بہت برا اثر پڑتا ہے!

جس طرح دنیا کی بہترین چیز ذائقہ ہے بالکل اسی طرح انسانی جسم کو چلانے کے لئے صاف، سادہ اور قدرتی پانی از بس ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ قدرت کا دیا ہوا صاف اور سادہ پانی ہمارے لئے سوائے فائدہ کے نقصان نہیں پہونچا سکتا لہٰذا قدرت کے اس بیش بہا عطیہ کو اس کی اصلی حالت میں استعمال کرنا ہی طبی نقطۂ نگاہ سے دانشمندی کی بات ہے۔

سید احمد اللہ ندوی

گلاب

دنیا میں یوں تو ہزاروں قسم کے رنگ برنگ کے پھول پائے جاتے ہیں، مگر گلاب کی کچھ اور ہی بات ہے، وہ اپنی دل فریبی، دل نوازی، عطر بیزی، خوب صورتی، خوش رنگی اور حسن موہنی صورت کی بنا پر پھولوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ بچے، جوان، بوڑھے، مرد، عورت سبھی اس کو دیکھ اور سونگھ کے لطف و مسرت حاصل کرتے ہیں انسان تو انسان بعض پرندے بھی اس کے عشق و محبت کا دم بھرنے میں مشہور ہیں۔ بلبل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ گلاب پر مرتا اور اس کے عشق و محبت کا دم بھرتا ہے۔ اسی گل و بلبل کے عشق کی داستان میں اردو میں بھی اتنی غزلیں لکھی گئی ہیں کہ اردو شاعری میں بدنام ہو گئی لیکن سچ پوچھئے تو اسی گل و بلبل کی محبت اور عشق نے ہمارے شاعروں کے خیالات کو جولانیاں بخشیں نئے نئے الفاظ دیئے، الفاظ میں ندرت، کلام میں جدت، محاوروں میں برجستگی، کہاوتوں میں شیرینی، جملوں کی ترکیب و بندش میں دلنوازی عطا کی، اور تخیل میں عالم بالا کی سیر کرا دی۔ کیا کوئی انکار کر سکتا ہے کہ ہماری اردو زبان جس کا شمار دنیا کی بڑی زبانوں میں کیا جاتا ہے۔ اسی گل و بلبل کے عشق کی توصیف و بیان کے ذریعہ شعرائے اردو زبان کے دائرہ کو تھوڑے ہی عرصہ میں کہاں سے کہاں تک پہونچا دیا اور اردو ادبیات کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اب ہر قسم کے جدید علمی خزانوں سے بھی مالا مال ہوتی جا رہی ہے۔ اس گل نے بلبل کے جگر ہی کو نہیں چیرا ہے جس کی دل سوز آواز کو سن کر ایک شاعر پکار اٹھا ؎

گل و گلچیں کا گلہ بلبلِ خوش لہجہ نہ کر
تو گرفتار ہوئی اپنی صدا کے باعث

بلکہ ہر زبان کے اصحابِ علم و فن کے دلوں کو بھی گل کے حسنِ دل افروز نے ایسا گرمایا کہ وہ بھی حال سے بے حال ہو گئے اور اس کی توصیف

توصیف میں رطب اللسان اور شیریں زبان ہو گئے اسی گل نے اردو کو مہ رخوں کی ستائش کے سلسلے میں گلعذار، گل رو، گل اندام، گل بدن اور گلنار جیسے خوبصورت الفاظ عطا کئے۔ وزیر اعظم آنجہانی پنڈت نہرو کو گل کا جمالِ جہاں آرا اتنا بھایا کہ وہ ہمیشہ اُسے اپنے سینہ پر رکھنے لگے۔ گلاب پھولوں کا بادشاہ ہے اس کی اصلی توقیر کسی بادشاہ کے دربار معلّٰی میں ہو سکتی ہے۔

گل کی سعادت اور شرف کے لئے یہ بات کیا کم ہے کہ حضرت خواجۂ خواجگان خواجہ غریب نواز خواجہ اجمیری کی قبر مبارک پر ہر روز ہزاروں کلیوں کی چادریں چڑھائی جاتی ہیں جن کی عطر بیزی سے آپ کا حظیرۂ قدس ہر وقت معطّر رہتا ہے۔

اس پھول کا نام ہندی میں گلاب، فارسی میں گل اور گل سرخ، عربی میں ورد اور انگریزی میں روز ہے۔ یہ مختلف رنگوں کا پایا جاتا ہے گہرا اور ہلکا سرخ کے علاوہ پیلے، سفید اور سیاہ رنگوں کے گلاب بھی بکثرت پائے جاتے ہیں اس میں بڑی دل آویز خوشبو پائی جاتی ہے۔ ولایت کے لوگ زکام کے ڈر سے خوشبودار گلاب پسند نہیں کرتے ہیں، اسی لئے ولایتی گلاب میں خوشبو نہیں ہوتی ہے، کیونکہ وہ ایسے ہی گلاب کی زیادہ تر پرورش کرتے ہیں، اور اکثر ولایتی گلاب سفید ہوتے ہیں۔ اگرچہ تجارتی اغراض سے گلاب کا خوشبودار سینٹ مزید بناتے ہیں۔

گلاب کے پودوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک جنگلی دوسری بستانی۔ بعض ملکوں میں کسان اپنے کھیتوں کے چاروں طرف جنگلی گلاب باڑھ کے لئے لگاتے ہیں، بعض گلاب بیلیں بیلی بھی ہوتی ہیں جو دیواروں، ٹٹیوں اور باڑھ پر چڑھائی جاتی ہیں۔ بستانی گلاب کے پودے اگر بیج سے حاصل کئے جائیں تو اُن کے پھولوں کی نوعیت بدل جاتی ہے، اس لئے کاشت کے لئے گلاب کے بیج بوئے نہیں جاتے بلکہ اس کی قلمیں لگائی جاتی ہیں۔ گھروں کی آرائش کی غرض سے گملوں، اور کونڈوں میں گلاب کی قلمیں لگاتے ہیں جن کے پودے ڈیڑھ دو فیٹ سے زیادہ اونچے نہیں ہوتے ہیں، کیونکہ گملوں میں جڑوں کے پھیلنے کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ برخلاف گلاب کی اُن قلموں کے جو چمن اور باغوں کی زمین میں نصب کی جاتی ہیں۔ اُن کے پودے چار پانچ فیٹ تک بلند ہو جاتے ہیں۔ یہاں زمین میں اُن کی جڑوں کے پھیلنے کی کافی گنجائش ہوتی ہے اور کافی کھاد بھی ڈالی جا سکتی ہے ہر پودے میں کئی کئی بڑی شاخیں پھوٹ کے

نکلتی ہیں اور ہر بڑی شاخ میں چھوٹی چھوٹی شاخیں نمودار ہوتی ہیں۔ شاخوں میں ننھے ننھے نوکیلے کانٹے ہوتے ہیں جو پھولوں کی حفاظت اور پہرہ داری کی خدمت انجام دیتے ہیں لیکن گلچیں ایسے سخت جفاکش ہوتے ہیں کہ نیتے ہاتھوں کو ان کانٹوں سے چھیدوا کر بھی گلاب کے پھول توڑ ہی لیتے ہیں۔ جب درخت گلاب کی ڈالیوں میں شگوفے لگتے ہیں تو سبز غلاف میں گلاب کی رنگین پنکھڑیاں پوشیدہ پوشیدہ رہتی ہیں، مگر جب گلاب کے شگوفے شگفتہ ہو جاتے ہیں تو اُسے شعرا کی زبان میں خندۂ گل کہتے ہیں۔ اس وقت سبز غلاف جو پنکھڑیوں کے نیچے پوشیدہ ہو جاتا ہے، اسی سبز غلاف کو طبی اصطلاح میں "اقماع" کہتے ہیں گلاب کی پنکھڑیوں کے بیچ میں باریک باریک ریشوں میں لپٹے ہوئے ننھے ننھے بیج ہوتے ہیں جن کو زیرۂ گل اور طب میں زرِ ورد کہتے ہیں۔

ہندوستان اور ٹرکی کا گلاب بہت مشہور ہے۔ ٹرکی کا عطرِ گلاب نہایت خوشبودار پائدار اور قیمتی ہوتا ہے۔ ایران اور لبنان کا گلاب بھی بہت اچھا ہوتا ہے۔ گلاب تقریباً ہر براعظم کے ملکوں میں پایا جاتا ہے اس لئے یہ "گلِ جہاں" ہے اور عالمی شہرت کا حامل ہے

گلاب کی پنکھڑیاں اُن کے بیج، اس کا سبز غلاف اور اس کی سبز پتیاں سبھی کام آتی ہیں۔ گلاب مزاج کے لحاظ سے اول درجہ میں بارد اور دوسرے درجہ میں یابس ہے۔ ایک خراب قسم کا گلاب بھی پایا جاتا ہے جس میں سخت بدبو ہوتی ہے اور اس کی بو ناقابلِ برداشت ہوتی ہے اس کا مزاج گرم ہے اور وہ محرق یعنی سوزندہ مزاج ہے۔

گلاب گرم، زرد رنگ کا مسکن اور قلب و دماغ کا مقوی ہے۔ وہ ملین اور مخرج صفرا ہے۔ اس کا شربت چند دفعہ پھولوں کو جوش دے کر بنایا جاتا ہے اور ہر دفعہ نئے پھول ڈالے جاتے ہیں۔ اسے شربت وردِ مکرر کہتے ہیں۔ اس میں اسہالی قوت تیز ہو جاتی ہے گلقند مقوی معدہ و جگر ہے اور بارد احشا (اندرونی اعضا) شکم کے لئے بھی موافق ہے۔ خشک گلاب دانت، مسوڑھوں اور باطنی اعضا کو تقویت دیتا ہے اور سجّ اور باطنی زخموں کے لئے مفید ہے۔ اگر بیرونی جانب خصوصاً مقعد یعنی بغل پس گوش اور کنج ران میں زخم ہو تو خشک گلاب کا سفوف اس پر چھڑکنا مفید ہے۔ گلاب کے سونگھنے سے بعضوں کو چھینکیں آنے لگتی ہیں

اور زکام پیدا ہوجاتا ہے۔ خشک گلاب اس کے سبز غلاف کے ساتھ استعمال کیا جائے تو نفث الدم کے لئے مفید ہے اور زیریں اعضاء کے درد اور برد مقعد کی شکایت کی حالت میں ٹب کے اندر گلاب کے جوشاندہ میں بٹھانے سے شکایت دور ہوجاتی ہے اور احشا کے زخم میں گلاب کے جوشاندہ کا حقنہ مفید ہے۔ خشک گلاب بدبودار پسینہ روکتا ہے۔ گلاب کے ساتھ مُر، سنبل الطیب اور قسط ملا کر خوشبو قسم کا ایک مرکب تیار کیا جاتا ہے۔ عرق گلاب تر گلاب کا نعم البدل ہے۔ عرق گلاب گرمی کے دنوں میں محفلوں میں گلاب پاش میں بھر کر مجمع میں چھڑکا جاتا ہے جس سے لوگوں میں فرحت و انبساط کی لہر دوڑ جاتی ہے اور گرمی کی کلفت وقتی طور پر دور ہوجاتی ہے۔ زردورد کا سفوف زبان کی پھٹن اور دانوں کے لئے جسے طب میں قلاع کہتے ہیں بہت مفید ہے، اس کے ساتھ سفید کتھ، دانہ الائچی اور سنگ جراحت ہموزن ملا لینا چاہئے۔ زردورد حابس اسہال بھی ہے۔ درخت گلاب کی سبز پتیاں دیگر ادویہ کے ساتھ عورتوں کے مرض سیلان الرحم کے لئے مفید ہیں۔ مگر ذائقہ اتنا کھٹا ہوتا ہے کہ اس کے استعمال سے مریض مستورات ناک بھوں چڑھاتی ہیں۔ اکثر اطباء نے گلاب کا مزاج مرکب القویٰ بتایا ہے۔ یعنی گرم دواؤں کے ساتھ گرم اثر رکھتا ہے اور سرد ادویہ کے ساتھ سرد اثر پیدا کرتا ہے۔

غرض گلاب کی پنکھڑیوں سے عرق گلاب، گلقند، روغن گل اور عطر گل تیار کیا جاتا ہے اور خشک گلاب جو گل سرخ کے نام سے طب میں مشہور ہے مختلف امراض میں ایک اہم جزو کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

نام جو گنوانے شروع کئے، انسپکٹر میروِن کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ جن کھانوں کا نام وہ لے رہی تھی ان کے متعلق اسے اتنا ہی علم تھا کہ پیرس کے قدیم دور میں ہی ان سے آگاہ تھے لہٰذا ایسے لوگ صرف انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ اس صدی کی نسل نے تو ان کا نام بھی نہیں سنا۔ معمولی آدمی کس شمار میں تھا، اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ بھی ان کا تصور تک نہ کر سکتے تھے۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا مادام!"

اُسے بہرحال کچھ نہ کچھ کہنا ہی تھا۔

مادام ہنسنے لگی۔ "انسپکٹر میروِن! میں نے اپنے دونوں شوہروں کو اسی فن سے ہلاک کیا ہے۔"

انسپکٹر میروِن کو حیرت زدہ چھوڑ کر وہ کہنے لگی: "میرا پہلا شوہر ستاون سال کا تھا اور دوسرے شوہر کی عمر ۶۵ سال کی تھی۔ دونوں سے شادی کرنے کے چند دنوں بعد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ میری شادی انسانوں سے نہیں بلکہ جانوروں سے ہوئی ہے۔ وہ مجھ سے کم سے کم مدت میں سب کچھ لے لینا چاہتے تھے اور میں اس کے لئے تیار نہیں تھی۔ میں زندگی کا حقیقی لطف اٹھانا چاہتی تھی اور وہ وحشی بھیڑیوں کی طرح مجھے چٹ کرنا چاہتے تھے۔ مجبوراً مجھے اپنے باپ کے اس فن کو کام میں لانا پڑا۔ آپ جانتے ہیں کہ میرے شوہر عمر کے جس حصے میں تھے اس عمر میں زیادہ طاقت ور اور مقوی غذا نقصان دہ ہوتی ہے خصوصاً میں نے جن کھانوں کا نام لیا، وہ بظاہر تو بہت خوش ذائقہ، ہلکے پھلکے اور بے ضرر ہوتے ہیں، لیکن ان کا مستقل استعمال ایک خاص مدت کے تحت مضر اور جوان آدمی کو قبر تک پہنچا دیتا ہے، کیونکہ یہ آنتوں کو ناکارہ کر دیتے ہیں اور لطف کی بات تو یہ کہ آنتوں کی خرابی کی کوئی علامت نظر نہیں آتی۔ میرے دونوں شوہر بوڑھے ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد آرام طلب بھی ضرورت سے زیادہ تھے۔ ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا، عیاشی، کھانا اور آرام۔ غذا ہضم کیسے ہوتی؟ یہ کھانے اتنے مزے دار ہوتے ہیں کہ ایک مرتبہ انسان انہیں چکھ لے تو ان کے بغیر رہ نہیں سکتا اور پھر ایسا انسان کہ دولت جس کی لونڈی ہو، میرے دونوں شوہر ایسے ہی تھے۔ چنانچہ میں نے انہیں ان کھانوں کا چسکا لگا دیا۔ بس پھر کیا تھا، کھاتے کھاتے اور انگلیاں چاٹتے چاٹتے سیدھے قبر میں جا لیٹے۔ اب بتائیے کہ اگر ان کی لاشوں کا پوسٹ مارٹم کیا

جائے تو کیا ہاتھ آئے گا۔ زہر یا عمدہ غذا؟
انسپکٹر میردن اس کی ذہانت پر حیرت زدہ
رہ گیا۔
"کیا انہیں معدے میں کبھی تکلیف
بھی نہیں ہوئی؟" اس نے پوچھا
"یہی تو ان کھانوں کی خوبی ہے۔ بات
یہ ہے کہ اگلے وقتوں کے رئیس زادے کھانے
کے علاوہ فنونِ حرب میں بھی طاق ہوتے تھے۔ گھوڑا
جنگ وجدال، ہر وقت مصروفیت، کھانا تو
کیا پتھر تک ہضم کر دیتی تھی۔ اس زمانے کے
رئیس زادے کاروں کے بغیر تو ایک قدم بھی چل
نہیں سکتے، اس پر عیاشی مستزاد۔ اگر معدے میں
طاقت ہو تو یہ غذا ہضم بھی ہو جائے، لیکن
دم بدم بڑھاپے کی طرف کشاں کشاں لیے جاتے
ہوئے مضمحل قویٰ کہاں متحمل ہو سکتے ہیں
بس یہ ہے راز ---!"
مادام چیاں انسپکٹر میردن کی آنکھوں
میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے لگی "میں نے کہا تھا
ناکہ میں اقبالِ جرم تو کر دوں گی، لیکن آپ اسے
ثابت نہیں کر سکیں گے۔"
انسپکٹر میردن اسے ایک لمحہ دیکھتا
رہا پھر اس نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔
"مادام میں پچاس سال کا ہو چکا
ہوں اور اب تک شادی کے بندھنوں سے
آزاد ہوں۔ میں بھی آپ کے ہاتھ کا لذیذ کھانا
کھانا چاہتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں ایسی
بُری شکل وصورت کا نہیں ہوں۔۔۔۔"
"مسٹر میردن! میں کبھی آپ کو یہ
پُراسرار حقیقت نہ بتاتی۔ آپ کے آتے ہی
میں نے یہ رائے قائم کر لی تھی کہ آپ میرے ہاتھ
کا کھانا کھانے والے تیسرے آدمی ہوں گے
لیکن آپ مریں گے نہیں، کیوں کہ میں ان
میں چٹکی بھر وہ چیز نہیں ملاؤں گی، جس کا
ذکر میں نے نہیں کیا۔ اور جو زہر بھی نہیں ہے۔
میں آپ کے ساتھ شادی کرنے کے لیے
تیار ہوں۔"

★ عورت فطرت کا حسین تحفہ ہے
★ عورت مرد کے جسم کا زیور ہے
★ عورت مرد کے جسم کا حسین پہلو ہے
★ عورت کی ہر ادا ایک فتنۂ قیامت ہے
★ عورت رونقِ محفلِ کائنات ہے
★ عورت بزمِ عشرت کی شمع ہے۔

سر کا درد

نئی تحقیق کی روشنی میں

"اُف، سر درد سے پھٹا جا رہا ہے، میں دفتر نہیں جا سکوں گا۔"

"کل رات سے میرے سر میں درد ہے اس لئے آج دفتر نہیں آ سکوں گا۔"

"سر کا درد، زکام، بخار ہو، اسپرو کھائیے اور صحت یاب ہو جائیے۔"

سر کا درد کچھ ہم مشرقی اور ایشیائی لوگوں ہی کا مسئلہ نہیں، بلکہ یہ شکایت مغرب، خصوصاً امریکا میں بھی اتنی ہی عام ہے۔ امریکہ کے نیشنل ہیلتھ سروے کی تحقیق کے مطابق ہر سال چالیس لاکھ امریکی درد سر کی وجہ سے دفتروں، اسکولوں اور دوسرے اداروں سے غیر حاضر رہ کر بستروں پر لیٹ جاتے ہیں۔ جدید تحقیق کی روشنی میں اسے دماغ کا درد تسلیم نہیں کیا جاتا، نہ ہی اسے عام بیماریوں جیسی ایک بیماری سمجھا جاتا ہے۔ نیویارک کے سب سے بڑے ہسپتال مونٹے فیورے میں باقاعدہ ایک درد سر یونٹ قائم ہے، جس کے سربراہ ماہر نفسیات ڈاکٹر آرنلڈ پی، فریڈمین ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس یونٹ میں گزشتہ بیس سال میں پندرہ ہزار سے زائد افراد زیر علاج رہے ہیں۔ یہاں یہ تجزیہ کیا جاتا ہے کہ درد سر کے محرکات اور اسباب کیا ہیں اور جو نتیجہ اخذ کیا گیا، وہ یہ ہے کہ درد سر کوئی مرض نہیں، بلکہ محض جذباتی ردعمل ہے۔

ڈاکٹر آرنلڈ یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ درد سر قبض، چھوت چھات یا بینائی کی کمزوری کے باعث ہوتا ہے۔ اُن کے خیال کے مطابق

دردِ سر کا تعلق زندگی کے مختلف مسائل پر ہمارے ردِ عمل اور اُس ذہنی کشمکش سے ہے کہ انھیں حل کس طرح کیا جائے۔ وہ اِس مرض کا اصل سبب جذباتیت کو ٹھہراتے ہیں۔ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ حادثات کے بعد لاحق ہونے والا دردِ سر بھی کسی ضرب یا چوٹ سے نہیں بلکہ حادثات پر ہمارے جذباتی ردِ عمل سے ہوتا ہے۔ اپنے اِس دعوے کا وہ یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ سر پر چوٹ لگنے سے سراسیمگی، اضطراب اور خوف جسم کے دوسرے حصوں پر چوٹ لگنے کی بہ نسبت زیادہ ہوتا ہے اور یہ اضطراب اور خوف ہی کا ردِ عمل ہے، جس سے سوچنے سمجھنے کی قوت مفقود ہو جاتی ہے، دماغ ماؤف ہو جاتا ہے۔ اعصاب میں کھنچاؤ پیدا ہوتا ہے اور ہم دردِ سر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

دردِ سر کو جذباتی ردِ عمل قرار دینے والے تنہا ڈاکٹر آرنلڈ ہی نہیں ہیں، نفسیات کے ایک اور ماہر ڈاکٹر فرینک جے آئیڈ جونز کا بھی یہی خیال ہے کہ دردِ سر جذبات کے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ اس کے پچاس فی صد مریض وہ لوگ ہیں، جو جذبات کے دھارے میں آسانی سے بہہ جاتے ہیں۔ گزشتہ سال امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس میں دردِ سر کو متفقہ طور پر کم حوصلگی کا نقاب بتایا گیا۔ شکاگو میڈیکل اسکول کے ڈاکٹر سیمور ڈائمنڈ کی تحقیق کے مطابق کم حوصلہ رکھنے والے چار سو افراد میں سے چونسٹھ فی صد دردِ سر کے مریض پائے گئے۔ انھوں نے بتایا کہ کم ہمتی کی وجہ سے دردِ سر محسوس کرنے والے یہ شکایت عموماً اتوار تعطیلات کے پہلے دن یا امتحان کے فوراً بعد محسوس کرتے ہیں۔ امریکی بحریہ کے ماہر نفسیات ڈاکٹر چارلس، ایس میولن نے انکشاف کیا کہ دور دراز علاقوں میں تنہائی کی زندگی بسر کرنے والے افراد خود کو ماحول میں ڈھالنے یا حالات کو سازگار بنانے کے لئے متواتر جد و جہد کرتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے اعصاب میں کھنچاؤ پیدا ہوتا ہے جسے وہ دردِ سر کا نام دیتے ہیں۔

ڈاکٹر فریڈمین کہتے ہیں کہ اقتصادی، سماجی یا جسمانی ضروریات کے حصول میں ناکامی سے دردِ سر پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح شکاگو کے ایک ماہر دردِ سر ڈاکٹر آرڈین، ایم اوسٹفیلڈ دردِ سر کو "عام غلط فہمی" سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسانی دماغ خواہ کتنا ہی زود حس ہو، اُس پر اعصاب کا اتنا دبیز جال پھیلا ہوتا ہے کہ اس میں

سوراخ کیا جا سکتا ہے، اُسے جلایا جا سکتا ہے، اسے کھینچا بھی سکتے ہیں، حتیٰ کہ توڑ سکتے ہیں، لیکن اس میں درد کا گزر نہیں۔

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ گردن میں درد اس مرض کا باعث ہے۔ گردن کے اعصاب پر بوجھ پڑنے سے درد اوپر کی سمت بڑھتا ہے اور سر کو متاثر کرتا ہے۔ اسے الیکٹرو میوگراف مشین سے بآسانی دیکھا جا سکتا ہے، جو اعصاب کی حرکات و سکنات کو بجلی کے ذریعہ ناپتی ہے۔

یہ ماہرین بتاتے ہیں کہ ہم اپنے جذبات کے اظہار میں اعصاب کا سہارا لیتے ہیں اور انہیں مدافعت کے لئے استعمال کرتے ہیں اعصاب پر مسلسل دباؤ سے گردن، ٹھوڑی کی ہڈی اور چہرے میں بھی کھنچاؤ پیدا ہوتا ہے جو دردِ سر کا باعث بنتا ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ کچھ لوگ خواب میں بھی جذباتی کھنچاؤ کا شکار رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نصف شب یا صبح بیدار ہونے پر دردِ سر کی شکایت کرتے ہیں۔

دردِ سر کی دوسری قسم نصف سر کا درد ہے۔ اس میں ڈیڑھ کروڑ سے زائد امریکی مبتلا ہیں۔ وہ اسے مگرین کہتے ہیں۔ مگرین یونانی لفظ ہیمی کرینیا سے مشتق ہے جس کا مطلب "نصف سر" ہے۔ اس سے لبا اوقات سر گرانی، قے، ٹھنڈا پسینہ اور روشنی سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ اس کی میعاد ایک گھنٹہ بھی ہے اور کبھی کئی دن بھی۔ اس کا حملہ دن میں متعدد بار بھی ہوتا ہے اور دنوں، ہفتوں، مہینوں، بلکہ برسوں کے وقفے سے بھی۔ عموماً یہ حملے تعطیلات کے اختتام پر، سماجی مصروفیات، کاروباری تفکرات کے دوران یا عورتوں کے ماہواری ایام میں ہوتے ہیں۔

اٹھارویں صدی سے قبل دردِ سر کا تعلق خون کے خلیات سے تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد تقریباً صد سالہ تحقیق نے یہ تعلق ثابت کیا۔ اس ضمن میں بوسٹن کے ڈاکٹر جان، آر گراہم، ڈاکٹر وولف اور ڈاکٹر اوسٹفیلڈ کے نام خاص طور پر نمایاں ہیں۔ ۱۹۳۷ء کے قبل سے ہی اس تحقیق میں سائنس کے جدید ترین تجربات سے کام لیا جا تا رہا ہے۔

ڈاکٹر اوسٹفیلڈ کہتے ہیں کہ دردِ سر کے مریض والدین کے ستر فی صد بچے اس کا شکار ہوتے ہیں۔ اگر دونوں میں سے ایک مریض ہو تو چالیس فی صد یا کسی کو بھی نہ ہو اور محض آباء و اجداد میں سے کسی کو رہا ہو

تو پچیس فی صد بچے اس میں مبتلا ہوتے ہیں ڈاکٹر ہنری، ڈی، اوگولڈن نے دردِ سر کے چار ہزار مریضوں پر تحقیق کے بعد نتیجہ نکالا کہ ان میں اکثریت ان عورتوں کی ہے جنھیں بیس سال کی عمر میں یہ مرض لاحق ہوا۔

ڈاکٹر فریڈمین کہتے ہیں کہ نصف دردِ سر کے مریض عموماً ذہین، حسّاس اور پختہ شعور کے مالک ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ زندگی کے مسائل کو متنوع تکنیک سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے آپ پر قابو رکھتے ہیں۔ یہ بچپن ہی سے ضبط و برداشت کے عادی ہوتے ہیں اور جب انھیں کوئی تکلیف پہونچتی ہے تو رونے اور دل کا بخار نکالنے کے بجائے اندر ہی اندر گھٹتے ہیں، جس کا صلہ انھیں شدید دردِ سر کی صورت میں ملتا ہے۔ ان میں سے اکثر مریض خواب آور گولیوں کا سہارا لیتے ہیں، لیکن یہ سودا انھیں مہنگا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر میلکم انگلینڈ جرنل آف میڈیسن میں لکھتے ہیں کہ دردِ سر کے لئے جو دوا بھی استعمال کی جائے گی، اس سے درد مزید ہوگا۔ گو وقتی طور پر اس میں کمی آجائے گی خصوصاً اے پی سی اور اسپرین تو نہایت مضر ہیں۔ اس کے باوجود امریکا میں درد سر کی دواؤں کا کاروبار خوب عروج پر ہے ہر سال تقریباً چار سو ملین ڈالر کی دوائیں فروخت ہوتی ہیں۔ حال ہی میں وہاں کے اخبارات کی اطلاع کے مطابق اسپرین کے گیارہ ملین ڈالر کے اشتہار ایک ایجنسی اور ادارے سے دوسرے میں منتقل کئے گئے۔ تاہم ڈاکٹروں کا عام خیال یہ ہے کہ دردِ سر کا بہترین علاج مکمل آرام ہے۔

بمبئی میں فانوس ڈائجسٹ کے
ہول ایجنٹ عبدالقادر بک ڈپو
مسجد روڈ، بمبئی ۱

انسدادِ جرائم میں کیمرے کا حصّہ

فنِ تصویر کشی نے موجودہ صدی میں جو غیر معمولی ترقی کی ہے وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اس فن کو بجا طور پر جرائم پیشہ لوگوں کا دشمن کہا جا سکتا ہے۔

سب سے پہلے ایک شخص ایلفونس برٹیلان نے تصویر کشی کو جرم کا سدباب کرنے میں استعمال کیا۔ اس نے سنہ ۱۸۸۰ء میں پیرس میں تفتیشِ جرائم کا ایک ادارہ قائم کیا۔ اسی وقت سے ملزموں کی تصویریں اتارنے اور انھیں محفوظ رکھنے کی منظم کوشش شروع ہوئی۔

ایک واقعہ

امریکا کی ریاست اوریگون کے ایک پہاڑی درّے پر تین ڈاکوؤں نے ایک ڈاک گاڑی کو روک لیا۔ گاڑی کے عملے کے چار آدمیوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ گاڑی کو بم سے تباہ کرنے کی کوشش کی اور خوف زدہ ہو کر پہاڑیوں میں غائب ہو گئے۔

اپنے پیچھے انھوں نے صرف دو لبادے چھوڑے جن پر سیاہی کے کچھ نشانات لگے ہوئے تھے۔ ایک بہت بڑے سائنسی ماہر ڈاکٹر ایڈورڈ آسکر ہینرچ کو اس واقعے کی تفتیش کے لیے مقرر کیا گیا۔

ابتدائی تحقیق کے بعد ماہر ڈاکٹر نے بتایا کہ یہ لبادہ ایک مضبوط، بائیں ہاتھ سے زیادہ کام کرنے والے شخص کا ہے جو غالباً لکڑی چیرنے والے کارخانے میں ملازم ہے۔ آس پاس کے تمام کارخانوں کی تلاشی لی گئی اور یہ پتہ چلا کہ تین بھائی ہگ، رائے اور رے ایک کارخانے میں ملازم تھے اور وہ اسی وقت سے غائب تھے جب یہ واقعہ رونما

ہوا تھا۔

موقعہ واردات پر موٹر کار کا ایک میگنیٹو MAGNETO بھی پڑا ہوا پایا گیا۔ جسے ان ڈاکوؤں نے بم کو مشتعل کرنے کے لئے استعمال کیا تھا۔ اس پر ہگ کی انگلی کا نشان بھی موجود پایا گیا جس سے یہ یقین ہو گیا کہ یہ تینوں بھائی ہی اس جرم کے لئے ذمہ دار ہیں لیکن وہ ایسے غائب ہو گئے کہ پولیس کی کوشش کے باوجود ان کا سراغ نہ مل سکا۔ ان کی انگلیوں کے نشانات بھی اس وقت تک بیکار تھے جب تک وہ گرفت میں نہ آ جائیں۔ پولیس کو اس کے سوا کوئی ترکیب نہ سوجھی کہ عوام کو ان کی صورت شکل سے آگاہ کر دیا جائے اور یہ اپیل کی جائے کہ جیسے ہی ان میں سے کسی کا پتہ چلے، پولیس کو اس کی اطلاع دے دی جائے۔

مجبور ہو کر پوسٹ ماسٹر جنرل ہیری ایس نیو نے حکم دے دیا کہ سارے ملک میں ان کی تصویریں چسپاں کر دی جائیں۔ چنانچہ تینوں بھائیوں کی بیس لاکھ تصویریں چھاپی گئیں اور ریلوے اسٹیشنوں، ڈاک خانوں اور دیگر نمایاں مقامات پر چسپاں کر دی گئیں اور اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص ان مفرورین کی گرفتاری میں مدد دے گا، اسے پینتالیس ہزار ڈالر انعام ملے گا۔ کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا اور ایک سال اسی طرح گزر گیا۔ مفرورین کی دس لاکھ مزید تصویریں شائع کر دی گئیں لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ دو سال اور گزر گئے کہ ایک دن ایک فوجی سپاہی سان فرانسسکو کے ڈاک خانے میں داخل ہوا۔ وہ ایک منی آرڈر بھیجنا چاہتا تھا۔ اس کی نظر ہگ کی تصویر پر پڑی اور وہ چلا اٹھا "ارے، یہ شخص تو میرے دستے میں رنگروٹ ہے۔" اگلے ہی دن ہگ کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا اور عدالت نے اسے عمر قید کی سزا دی۔

رائے اور رے ابھی تک غائب تھے محکمہ ڈاک نے ان کی مزید تصویریں شائع کیں اور ان دونوں بھائیوں کو اوہیو میں گرفتار کیا گیا۔ ان کا بھی وہی انجام ہوا۔ جو ان کے بھائی کا ہوا تھا۔ ان دونوں نے اپنے آپ کو بدلنے کی بہت زیادہ کوشش کی تھی۔ اپنے بال رنگ لئے تھے، اور بڑی بڑی مونچھیں اگا لی تھیں، لیکن ان کی تصویروں اور عوام کے تعاون نے ان کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔ کیمرہ حقیقت میں مجرموں کا دشمن ہے۔

طرح طرح کے کیمرے

مجرموں کی شناخت اور جرائم کا سراغ لگانے کے لئے کیمرہ صرف اتنی ہی خدمت انجام نہیں دیتا کہ اس کی مدد سے مشتبہ لوگوں کی تصویریں اتار لی جائیں، بلکہ مختلف مقاصد کے لئے مختلف قسم کے کیمرے ایجاد ہو چکے ہیں مثلاً انگلیوں کے نشانات کی تصویر لینے کیلئے جداگانہ کیمرہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ارتکاب جرم کی جگہ ہاتھ یا انگلیوں کا جو نشان باقی رہ جاتا ہے، وہ بے حد خفیف اور کمزور ہوتا ہے معمولی کیمرے سے اس کی تصویر نہیں لی جاتی۔

جدید آلات اور کیمیائی محلولات کی بدولت یہ بھی ممکن ہو گیا ہے کہ دھندلے سے دھندلا نشان بھی اُبھارا جاسکے اور اس کی تصویر اُتار لی جائے۔ مغربی ممالک کی عدالتوں کے ساتھ ایسی سائنسی تجربہ گاہیں ملحق ہیں جو اس قسم کے سائنسی تجربات کرتی رہتی ہیں۔ فرض کیجئے ماہر جرمیات کو کسی مقدمے کی تفتیش کرنی ہے لیکن مجرم کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ دوران تفتیش میں پولیس کو ایک کاغذ ملتا ہے، اور اسے یہ شک ہوتا ہے کہ اس کاغذ پر مجرم کی انگلیوں کے نشانات موجود ہوں گے اگرچہ وہ نظر نہیں آرہے ہیں۔

اِن نشانات کو اُبھارنے اور اس قابل بنانے کے لئے کہ اُن کی تصویر اُتاری جاسکے، آیوڈین کی فلمیں استعمال کی جاتی ہیں ایک کھلی پلیٹ میں ایسی چند فلمیں لے کر پلیٹ کو شیشے کے ایک بڑے مرتبان میں رکھ دیا جاتا ہے جس کا ڈھکنا ہوا اور گیسوں کو باہر نہیں نکلنے دیتا۔ فلموں سے آیوڈین گیسیں خود بخود اُٹھنی شروع ہو جاتی ہیں۔ جیسے ہی ایسا ہوتا ہے، وہ کاغذ جس پر نشانات موجود ہونے کا شک ہے، اِن گیسوں کے اندر رکھ دیا جاتا ہے اور فوراً ہی بھورے رنگ کے نشانات اُس پر اُبھر آتے ہیں۔ تیزی سے ایک خاص کیمرے سے اُن کی تصویر اُتار لی جاتی ہے۔

چھے ماہ گزر جانے کے بعد بھی کاغذ میں پوشیدہ نشانات کو سلور نائٹریٹ کے محلول کی مدد سے اُجاگر کیا جاسکتا ہے۔ صرف یہی نہیں خاص طرز کا ایک کیمرہ دھاتوں کی سطح پر سے بھی انگلیوں کے نشانات اُسی خوبی سے اٹھا سکتا ہے جس طرح کاغذ پر سے۔ اسی کیمرے کی بدولت ایک بدترین جرم کا انکشاف کیا گیا تھا اور مجرموں کو کیفر کردار تک

پہنچایا گیا۔

ایک اور واقعہ

امریکا کی ریاست کولوریڈو میں چار مجرمیں نے نیشنل بنک پر چار ڈاکوؤں نے حملہ کیا اور صدر و خزانچی کو ہلاک کر کے دو لاکھ ڈالر لوٹ کر فرار ہو گئے۔ اس مار دھاڑ میں اُن کا ایک آدمی بھی کچھ زخمی ہوا۔ اس کے علاج کے لئے اُنھوں نے ونیجر نامی ایک ڈاکٹر کو اغوا کیا اور اُس پر زور دیا کہ وہ اُن کے زخمی ساتھی کا علاج کرے۔ علاج کے بعد انھوں نے ڈاکٹر کو بھی قتل کر دیا اور اُس کی کار ایک کھڈ میں پھینک دی۔

ساری داستانِ جرم میں تفتیش کرنے والوں کو صرف ایک چیز نظر پڑی اور وہ تھا انگلی کا ایک نشان جو اس کار کے دروازے پر ثبت تھا۔ اس نشان کی تصویر اُتار لی گئی اور سارے ملک میں اُس کی اشاعت کی گئی۔ اسی ایک نشان کی مدد سے سال بھر بعد قاتل گرفتار کر لیا گیا اور کولوریڈو میں اُسے سزائے موت دی گئی۔ باقی تین مجرم بھی گرفتار کر لیے گئے اور اُنھیں بھی سزائے موت دی گئی۔ اسی طرح ایک اور نشانِ انگشت نے چار قاتلوں کو پھانسی دلائی یہ سب کچھ نئی طرز کے ایک کیمرے کی بدولت

ممکن ہوا جسے "انسپکٹروگراف" کہتے ہیں۔

ایک نئی سائنس

کیمرے اور خردبین کے اشتراک سے ایک نئی سائنس نے جنم لیا ہے جسے "فوٹو مائیکروگرافی" کہتے ہیں۔ یہ سائنس کیمرے اور خردبین کے مشترکہ عمل سے وہ نشانات حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے جو بادی النظر میں ظاہر نہیں ہوتے۔ اس قسم کے نشانات کی بے شمار قسمیں ہیں۔ دھاگے، بال، رسی کے ریشے، خون کے دھبے، بنک کے چیک کے کناروں پر جو کٹاؤ ہوتے ہیں اُن کا درمیانی فرق۔ اِس قسم کی تمام شہادتیں خردبین دیکھتی ہے اور اُس کا کیمرا اُن کی تصویر اُتار لیتا ہے۔

ایک کیس میں جرم کی جائے وقوع پر ایک ٹوٹی دیا سلائی پڑی ہوئی ملی۔ ایک شخص پر شبہ تھا۔ اُس کی تلاشی لی گئی تو اُس کے واسکٹ کی جیب سے اُس دیا سلائی کا باقی ماندہ حصّہ ملا۔ دونوں حصوں کو خردبین کے نیچے رکھ کر تصویر اُتاری گئی تو معلوم ہوا کہ دونوں ایک ہی دیا سلائی کے دو حصے ہیں اِس طرح پولس کو یقین ہو گیا کہ یہ شخص جرم کی جائے وقوع پر موجود تھا۔

ٹیلسکوپ ایک اور بصری آلہ ہے جس کی مدد سے خوردبینی اشیا بڑی نظر آنے لگتی ہیں۔ وہ ان کے عکس کو بڑھا چڑھا کر شیشے کی ایک دھندلی پلیٹ پر ظاہر کر دیتا ہے۔ انگلیوں اور اسلحے کے نشانات پرکھنے کے لیے یہ آلہ اکثر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی مدد سے ایسے نشانات کا کافی دیر تک مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

جرائم کی تفتیش کے علاوہ اب فوٹو مائیکروگرافی کی مدد سے ہیرے جواہرات تک پرکھے جا رہے ہیں۔ بہترین ہیرے میں بھی کوئی نہ کوئی خامی ہوتی ہے مثلاً اگر اس کے اندر کوئی بلبلہ یا کسی قسم کا خلا موجود ہے تو وہ جوہری کے شیشے سے نظر نہیں آ سکتا۔ اس قسم کے نقائص سے ہیرے کی قیمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن اس خصوصیت کی بنا پر اس کی پہچان میں مدد مل سکتی ہے اور اگر وہ گم ہو جائے تو اسی بنا پر اسے تلاش بھی کیا جا سکتا ہے۔

ایسے ہیروں کی تصویر لینے کے لیے ایک خاص طرز کا کیمرہ استعمال کیا جاتا ہے جو ان کی خامیوں کو ظاہر کر دیتا ہے۔ ان خامیوں کے درمیانی فاصلے کو بھی نہایت صحت کے ساتھ ناپا جا سکتا ہے۔ ہیرے کے گم ہو جانے پر پہلے ہی سے اس قسم کی تصویریں پولیس کو دے دی جاتی ہیں۔ قیمتی اشیا رہن رکھنے والوں کے پاس بھیج دی جاتی ہیں جوہریوں میں تقسیم کر دی جاتی ہیں اور دوسرے شہروں کی خفیہ پولیس کو بھیج دی جاتی ہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ جواہرات کی بے انتہا قیمت نے ان کے بین الاقوامی قسم کے چور پیدا کر دیے ہیں۔ ایک ہیرا امریکا سے چرایا گیا۔ اس کی بعض کیفیات یورپ اور دیگر براعظموں کو وائرلیس کے ذریعے فوراً بھیج دی گئیں اور اس طرح یورپ کے ایک شہر میں اس کی غیر قانونی فروخت کو بروقت روک دیا گیا۔ ہیروں کی اندرونی خصوصیات کو فوراً دور دراز مقامات تک پہنچانے کے لیے محض وائرلیس ٹیلی گرافی سے کام نہیں چلتا بلکہ وائرلیس فوٹو گرافی سے کام لیا جاتا ہے تاکہ ہیرے کی اندرونی تصویر دور دور پہنچ جائے۔ یہ طریقہ "ٹیلی سسٹم" کہلاتا ہے لیکن یہ اس قدر مہنگا ہے کہ معمولی امور کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ جب کبھی کسی ہیرے کے گم ہونے کی وجہ سے لاکھوں ڈالر کا نقصان سامنے ہوتا ہے، تب یہ طریقہ کام میں لایا جاتا ہے۔

الغرض جدید کیمروں اور ترقی یافتہ فن تصویر کشی نے ارتکاب جرم کو روکنے اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، یہ فن برابر ترقی کر رہا ہے۔

روسی کہانی

ظ۔ انصاری

طوفان کا نقیب

سمندر کی سیمیں سطح پر اڑا کر وہ لائی ہوا
بادلوں کو۔ وہ گھنگھور بادل، وہ پر شور ساگر
— درمیاں میں وہ بجلی کی مانند بیکل پرندہ
جیسے گھن گرج کی خبر دینے والا، وہ لہرا رہا ہے
الٹا پلٹتا چلا جا رہا ہے۔

لہروں نے کبھی موج کو چھو کے بھاگے
کبھی ابر کو تیر سا مار آئے، صدا دے، صدا اس
کا نعرہ ہے، مردانہ نعرہ جسے سن کے کالی
گھٹا جھومتی ہے۔

صدا اس کی ایک چیخ ہے، جس میں طوفاں
کی آرزوئیں بھری ہیں۔ سنی بادلوں نے اسی چیخ
میں: غیظ کی گھن گرج، شوق کی شعلہ افشانیاں
اور یقین فتح کا۔

آہیں بھرتی ہیں بےچاری مرغیاں،
آہیں بھرتی ہیں، پانی پہ مارتی ہیں، بس چلے
تو سمندر کی تہہ میں، اپنی طوفان سے وحشت زدہ
بیقراری چھپا دیں۔

بطخیں سسکیاں لے رہی ہیں انھیں
کیا خبر کیلئے ہے رسم وہ شاہبازی، معرکہ
زندگی کا — ضرب پڑتی ہے طوفان، ان
کے دل ہولتے ہیں۔

پن گوئین یہ سمندر کا بےعقل باسی
اپنے چربی چڑھے جان و تن کو لئے جا رہا ہے کہ
چھپ جائے کہسار میں، یا کسی غار میں....
ہاں! مگر یہ پرندہ، خبر دینے والا کہ طوفان آتا
ہے، ہوشیار ہوا سینہ تانے ہوئے، اپنے
پل پر سمندر کے جھاگوں سے دھوئے ہوئے
سر پہ ٹھونگیں لگاتا ہوا، دندناتا ہوا!
وہ گھٹا جھومتی آئی اور ساگر پہ پر جوڑ کر
جھک گئی۔ موجیں گانے لگیں، اور دھم مچلنے
لگیں — "آ کہ ہم منتظر ہیں"۔

وہ طوفان آیا، گرجتا ہوا۔ موجیں
کف در دھن ہیں، ہواؤں سے دست و گریباں
ہیں، لیکن کراہوں سے لڑتے ہوئے ان کے

سینے۔ ہوا طیش میں آ کے بھرتی ہے موجوں
کی کولی، پھینکتی ہے اٹھا کر ادھر دور
کہسار پر۔ نوکیلی چٹانوں پہ جا کر پڑیں
موجیں، اور چھینٹے اٹھے، سنگ ریزے
اڑے، زمرد کے ٹکڑے اڑے۔

پرندہ بجلی کی مانند بیکل پرندہ
بڑے گھن گرج کی خبر دینے والا، تیر کی طرح
بادل کا سینہ پرو کر موج کے جھاگ میں اپنے
بازو بھگو کر، چیختا جا رہا ہے۔

جن ہے، طوفان کا جن، وہ چلا،
سینہ تانے ہوئے، سر اٹھائے ہوئے۔ نگاہ
ہنستا ہوا، نگاہ روتا ہوا! . . . .
بادلوں پر ہنسے اور روئے خوشی سے۔

غیظ طوفان کا، کیا حقیقت ہے
اس کی، یہ طوفان کا جن حقیقت کو سمجھا!
گھن گرج میں تھکن سن چکا ہے، یقین ہے
اسے، ان گھٹاؤں کے بس میں نہیں۔
بادلوں کے غلافوں سے سورج چھپانا،
نہیں، ان کے بس میں نہیں!

ہوا سائیں سائیں کئے جا رہی ہے
کڑکتی ہے بجلی، گرجتے ہیں بادل . . . .
چمکتے ہیں شعلے سمندر کے اوپر، سمندر
جس کا کوئی چھ نہیں ہے پکڑتا ہے بجلی
کے تیروں کو۔ اور اپنے بھنور میں بجھاتا
چلا جا رہا ہے۔ جیسے یہ آتشیں سانپ ہیں،
جو سمندر میں پھنکارتے ہیں، اور پھر ڈوبتے
ہیں، ابھرتے ہیں۔

گھن گرج، گھن گرج، چھڑ گئی زور
کی! وہ بہادر پرندہ، خبر دینے والا، کہ
طوفان آتا ہے، ہشیار ہو، اکڑتا ہوا، دندناتا
ہوا، بجلیوں سے پروں کو چھواتا ہوا ـــ
غضبناک ساگر پہ بل کھا کے لہرا رہا ہے
چیختا جا رہا ہے، فتح کی پیش گوئی ہے، اس
کی صدا!

پھٹ پڑ اے طوفان! دکھا دے
زور، ہاں دیکھیں تو ہم! . . . . . . "

● ہماری زندگی کا وہ حصہ جو دنیا
کے ہنگاموں سے الگ تھلگ
رہ کر گذرتا ہے: وہ دیدۂ بینا
کے لئے بصیرت کے نئے نئے
باب کھولتا ہے
● اس دنیا میں وہ کون ادیب
ہے جو ہمیں حسن کے بھیدکھ سمجھا دے
جو عورت کی آنکھ سمجھاتی ہے:
شیکسپیئر

داؤدی بوہرہ جماعت

تاریخ کے آئینے میں

تقدس مآب سیدنا اُس عظیم فاطمی میراث کے وارث ہیں جس نے اسلام کی تاریخ میں زرّین باب کا اضافہ کیا۔ وہ فاطمی دعوت کے سربراہ اور امام مولا علی کے سچے نائب ہیں۔ یہ وہی فرقہ ہے جس نے ادب، فنونِ لطیفہ، فلسفہ فنِ تعمیرات، فنِ نجوم اور علمِ ریاضی میں زبردست کامیابی کے جھنڈے گاڑے ہیں۔ فاطمی اماموں کی جدوجہد کا ثمر کہ ہمیشہ مذہب رہا ہے۔ علم و ادب کا یہ کارواں عرب کے ریگزاروں سے گزرتا ہوا وادیٔ نیل کی شاداب وادی میں پہنچا اور "جامعہ الازہر" جامع ازہر مسجد کی شکل میں قاہرہ میں یکار۔ قاہرہ فاطمی دورِ حکومت میں مسلمانوں کا دارالسلطنت تھا۔ اب یہ کارواں گجرات کی سرزمین سورت میں "الجامعۃ السیفیہ" کی شکل میں ظہور پذیر ہے۔ فاطمی اپنے ابتدائی زمانے سے لیکر آج تک علم و ادب کے شائق رہے ہیں

"الجامعۃ السیفیہ"

یہ شاندار عربی کالج جو سورت میں واقع ہے، علم و ادب کا گہوارہ ہے۔ یہ ادارہ دراصل جامعہ الازہر کی نقل ہے۔ شہر قاہرہ اور جامعہ الازہر کی بنیاد فاطمی اماموں نے رکھی۔ الازہر مسجد کے بانی امام المعز الدین اللہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب اور علم کی ترقی ہمیشہ فاطمی اماموں کا شیوہ رہا ہے۔ سورت میں واقع عربی کالج کی ایک محراب جامعہ الازہر کی محرابوں کی عمدہ شبیہ ہے۔

نایاب لائبریری

فاطمی عہد کے بارے میں جن مقتدر لوگوں نے علمی و ادبی تحقیقات کی اور کتابیں مرتب کیں، اُن میں سیدنا ابی حاتم الرازی، سیدنا قدحی النعمان، سیدنا معید شیرازی،

سیدنا المعز قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ قاضی النعمان بن محمد نے "المجالس والمسائرت" "افتتاح الدعوۃ" اور دعائم الاسلام نامی کتابیں لکھیں جو فاطمی عقاید اور طرز زندگی کی ترجمان ہیں۔ ان کے علاوہ ہزاروں مخطوطات، دستاویزات اور قلمی نسخے سیدنا کی لائبریری میں موجود ہیں جن سے بیش قیمت معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ لائبریری ۱۵۳۹ء میں ہندوستان میں منتقل ہوگئی۔ جب فاطمی اماموں نے اپنا مرکزِ عمل اس ملک میں منتقل کر دیا۔ یہ لائبریری اب تک نہ صرف محفوظ ہے بلکہ اس میں بہت سی عمدہ اور نادر کتابوں کے اضافے بھی ہوئے ہیں۔

عیون الاخبار

مسودات کا یہ مجموعہ جو سیدنا کی لائبریری میں محفوظ ہے، فاطمی عہدِ حکومت کے بارے میں قیمتی معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ اس کے مرتب سیدنا ادریس امام الدین ہیں جنھوں نے ۱۴۶۲ء میں اسے مرتب کیا تھا۔ اس کی سات ضخیم جلدیں ہیں، جن میں بڑی تحقیق کے ساتھ تاریخی حالات و واقعات کی تفصیلات درج کی گئی ہیں۔ اس طرح سیدنا ادریس امام الدین پہلے مورخ تھے جنھوں نے بڑی مشقت سے فاطمی عہد کے حالات کی تفاصیل اکٹھا کیں اور اسے ایک مثالی تاریخ میں تبدیل کر دیا۔ علاوہ ازیں اس تاریخ سے مصریوں کی تہذیب و عقاید کے بارے میں بھی عمدہ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ داودی بوہرہ فرقہ کی طرزِ معاشرت بڑی حد تک مصری تہذیب کی ہندوستانی شکل ہے۔ علاوہ ازیں بے شمار کتابیں ایسی ہیں جو فاطمیوں کی تہذیب و معاشرت پر روشنی ڈالتی ہیں اور جن سے بوہرہ ملت کے ماضی کے کارناموں کا اندازہ ہوتا ہے۔

تہہ دار شخصیت

تقدس مآب سیدنا برہان الدین صاحب

اپنی فصاحت و بلاغت، زورِ بیان اور بلند تخیل کے لئے مشہور ہیں۔ آپ ہزاروں افراد پر مشتمل مجمع کو اشکبار کر سکتے ہیں ساتھ ہی ساتھ انھیں قہقہہ لگانے پر بھی مجبور کر سکتے ہیں۔ آپ انتہائی تیز شعور اور بے حد حساس دماغ رکھتے ہیں۔ آپ تقریر کرتے وقت سامعین کو بالکل مسحور کر دیتے ہیں جب کبھی آپ کلاس لیتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آپ پیدائشی معلم ہیں۔ آپ حافظِ قرآن ہیں۔ جب کبھی تنہا ہوتے ہیں

تو آیاتِ قرآن کے وِرد انھیں روحانی لذت و سکون بخشتے ہیں۔ جب داؤدی بوہرہ فرقہ نے ۱۹۵۷ء میں "امام علی" کی چودہ سو ویں برسی نہایت عظیم الشان طریقے سے بمبئی میں منائی تو اس تقریب کے دولہا بھی آپ ہی تھے۔ یہ تقریب آج بھی حاضرین کے دماغوں سے محو نہیں ہوئی۔

باعثِ فخر

تقدس مآب سیدنا برہان الدین صاحب ایک مذہبی پیشوا ہی نہیں بلکہ زندگی کے دشوار راستوں کے عمدہ رہبر بھی ہیں۔ آپ امیر و غریب سب سے مخلصانہ طور پر ملتے ہیں آپ کی شیرینی دلوں میں گھلتی محسوس ہوتی ہے آپ کی باتیں عقل و دانش کے ادراک ہیں آپ کے مشورے پرخلوص اور صادق ہیں آپ کی ذات ہر لحاظ سے بوہرہ فرقہ کے لئے باعثِ فخر ہے۔ جو آج ۵۲ ویں داعی المطلق اور سیدنا مرحوم کے جانشین اور امام علی کے سچے نائب ہیں

زبردست تنظیم

یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ مسلمانوں کے بے شمار فرقوں میں چند ہی فرقے ایسے ہیں جو ہر لحاظ سے ترقی یافتہ اور خوش حال ہیں۔ ان میں داؤدی بوہرہ جماعت بھی شامل ہے اگرچہ بوہروں کی تنظیم ۷۵ کروڑ مسلمانوں کے مقابلہ میں چھوٹی ہے مگر یہ بے حد مضبوط اور مستحکم ہے۔ ان کے باہمی تعلقات مثالی ہیں یہ ایک دوسرے کی معاونت دل و جان سے کرتے ہیں۔ مذہب کو دنیاوی معاملات سے الگ نہیں کرتے بلکہ دونوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ عام مسلمانوں کے بہ نسبت یہ زیادہ روشن خیال اور تعلیم یافتہ ہیں۔ شادی بیاہ کے معاملات میں مذہب کی سختی سے پیروی کرتے ہیں۔ ان کی عورتوں نے اگرچہ عام طور پر پردے کو خیرباد کہہ دیا ہے اور اپنے آپ کو بہت حد تک جدید تہذیب میں ڈھال لیا ہے مگر اس کے باوجود وہ مذہب سے بیگانہ نہیں۔ روزہ نماز کی پابند اور داعی المطلق کے پیرو ہیں۔ ان کے مذہبی پیشواؤں کے گھروں کی عورتیں آج بھی انتہائی سخت کا پردہ کرتی ہیں۔

بوہروں نے ملک اور قوم کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے مگر اس کے باوجود یہ بات لائقِ افسوس ہے کہ عام مسلمانوں کے ساتھ ان کے تعلقات گہرے نہیں اور نہ ہی

یہ اُن کے معاملات میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ بوہرہ برادران عام مسلمانوں سے گھل مل جائیں اور اُن کے دکھ سکھ کو اپنا دکھ سکھ جاننے لگیں تو مسلمانوں کی پوزیشن کچھ بہتر ضرور ہو جائے۔ بوہرہ بھائیوں کی معاونت مسلمانوں کے بدتر معاشی حالات کو یقیناً کچھ بہتر بنا سکتی ہے۔ یہ بوہرہ یا ناگی مسلمانوں کے ہی بازو ہیں۔ کاش! ایک اللہ ایک رسول، ایک قرآن اور ایک اسلام کی بنیاد پر یہ اپنے فرقے کی محدود چہار دیواری سے نکل کر اپنے ہی بھائیوں کے لئے باعث رحمت بنتے ــــ!!

بقیہ صفحہ ۱۱۲ کا

ایک ایک ذرہ قیس کی اس سفاکانہ حرکت پر پیچ و تاب کھا رہا تھا ــــ جزیرۃ العرب کی پوری فضا اس سانحے سے سوگوار ہو گئی تھی ــــ نخلستانوں میں غم واندوہ کی تاریکی چھا گئی تھی ــــ اور ادھر جمیلہ کی ماں اس دل فگار منظر کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی ــــ اس کے دل کی حرکت بند ہو چکی تھی ــــ!!!

کیا آپ یاد کریں گے کہ پچھلے سال میرے کانوں کا آپریشن کر کے اُن کے اندر ایک باریک سا تار لپیٹ دیا گیا اور میری قوتِ سماعت لوٹ آئی؟ یہ حقیقت ہے کہ اس آپریشن کی بدولت جب کئی سالوں کے نپٹ بہرے پن کے بعد میرے کانوں میں گرد و پیش کی آوازیں آنے لگیں تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ لوگوں کی سرگوشیاں، نسیمِ سحر کی سرسراہٹ، کہیں دور چلنے والے انجن کی گڑگڑاہٹ، کوّے کی کائیں کائیں اور کتّے کے بھونکنے کی آواز میرے کانوں کو سُریلی موسیقی معلوم ہونے لگی۔ یہ تمام آوازیں دوسروں کے لئے معمولی تھیں، لیکن میرے لئے مسحور کن راگوں سے کسی طرح

ٹِک ٹِک ٹِک...

کم نہ تھیں۔ آپریشن کو کئی ماہ گزر چکے ہیں، لیکن میں آج بھی جب رات کی تاریکی میں بستر پر دراز ہو کر گھڑی کی ٹِک ٹِک ٹِک سنتا ہوں تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلنے لگتی ہے۔

ایک لمحہ کے لئے تصور کیجئے کہ آپ کا آپریشن ہو چکا ہے، اور آپ ہر قسم کی آواز سننے لگتے ہیں، یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن اس سے عجیب تر سنسنی تھی جو میں نے اُس وقت محسوس کی جب میرے کان ایک مرتبہ پھر کام کرنے لگے۔ میں دونوں کانوں سے بہرہ تھا اور دس سال تک اپنے کانوں سے آلۂ سماعت لگائے پھرتا تھا۔ لیکن اب مجھے اس کی بالکل ضرورت نہ تھی، کیوں کہ یہ بات عیاں ہو گئی تھی کہ اب مجھے وہ کان مل گئے ہیں جو بند

نہیں کیے جا سکتے تا آنکہ سماعت کا بٹن دبانے
سے ہر قسم کی آوازیں بند ہو جایا کرتی تھیں
لیکن اب میں ایسا نہیں کر سکتا ہوں۔ شروع شروع
میں مجھے ہر آواز بڑی تیز معلوم ہوتی تھی، اگر
کوئی دروازہ بند کرتا تو مجھے یوں لگتا کہ کسی
نے بڑے دھماکے سے بند کیا ہے۔ جب میں
اپنا برقی سیفٹی ریزر استعمال کرتا تو ایسا معلوم
ہوتا کہ کوئی سیمنٹ ملانے والی مشین شور مچا رہی
ہے۔ کھانے کے دوران برتنوں اور چھری
کانٹے کی آوازیں عجیب و غریب لگتیں۔ ایک
دن جب میں نے اپنی موٹر کا انجن سٹارٹ
کیا تو اس کا شور سن کر مجھے جھرجھری آگئی
شام کو میں چہل قدمی کے لیے بازار کی طرف
نکل گیا تو ٹریفک کے شور سے میرے کان پھٹنے
لگے اور میں کسی پر سکون اور خاموش مقام پر
پہنچنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن پھر آہستہ
آہستہ میں اس شور و غوغا کا عادی ہو گیا۔

تقریر، گفتگو، موسیقی یا دوسری آوازیں
سننے کی قابلیت ایک جیسی کم نہیں ہوتی،
سننے والے اعصاب ہر قسم کی آوازوں کو جمع کرتے
ہیں، جن میں بعض مدھم ہوتی ہیں، بعض بہت
بلند اور بعض درمیانے درجے کی ہوتی ہیں۔ جب
آپ کسی ایسے شخص سے باتیں کرتے ہیں جو
بمشکل سن سکتا ہو تو ہو سکتا ہے کہ وہ آپ
کی باتیں سمجھ لے لیکن اگر گفتگو کے دوران میں
اسے ایک دو الفاظ سنائی نہ دیں تو وہ
آپ کے فقرے کے مطلب کو بالکل سمجھ نہیں
سکے گا۔

ہر آواز جو آپ سنتے ہیں، کان کے
ڈرم یعنی ڈھول میں ارتعاش پیدا کرتی ہے
یہ مرتعش آوازیں تین ننھی منی ہڈیوں میں
سے گزرتی ہیں جو کان کے درمیانی حصے میں
ہوتی ہیں، جن میں سے دو کے لمبے سرے اور
ایک چھوٹی سی ہڈی کان کے پردے پر لگی ہوتی
ہے۔ جب آواز کی بیرونی لہریں بیرونی حصے
کے اندر جا کر کان کے پردے پر لگتی ہیں تو
ان چھوٹی چھوٹی ہڈیوں میں حرکت پیدا ہوتی ہے
اور ان کے توسط سے آواز کی لہریں اندرونی
حصے میں چلی جاتی ہیں اور عصب سماعت
کے ذریعے دماغ ان کو محسوس کرنے لگتا ہے
سرجری کے اس حیرت انگیز معجزے کو
جس نے مجھے دوبارہ قوت سماعت بخشی،
stapedectomy کہتے ہیں۔

otoscleroses کی وجہ سے جن کی
بناوٹ ہڈیوں کے اسفنج نما ڈھانچے کی سی ہو جاتی
ہے، دونوں کانوں میں ارتعاش کی ترسیل

بند ہو جاتی ہے۔ اس ڈاکٹر نے جس نے آپریشن کیا نہایت طاقتور خوردبین استعمال کی اور کان کی نالی کو چیر کر کان کے ڈھول کو اوپر اٹھا لیا اور بڑی احتیاط سے ایک ننھی ہڈی کو ہٹا دیا پھر اس نے کان کی لو سے کچھ موٹا سا چربی والا حصہ کاٹ کر اس کے گرد ایک بال کی طرح باریک فولادی تار باندھ دیا۔ جب یہ کٹا ہوا حصہ تیار ہو گیا تو اسے کان کے مطلوبہ حصے میں داخل کر دیا گیا۔ بقیہ تار کی پیمائش کی گئی اور جو زائد تھی، کاٹ دی گئی۔ تار کے دوسرے سرے کو موڑ دیا گیا جب آپریشن مکمل ہو گیا تو میری قوتِ سماعت عود کر آئی۔

یہ آپریشن کوئی نئی دریافت نہ تھی۔ ڈاکٹروں کو معلوم تھا کہ otosclerosis بہرے پن کی موجب ہے۔ اس زمانے میں بھی آپریشن کیے جاتے تھے، مگر ان دنوں اعلیٰ قسم کی برقی روشنی، آلاتِ جراحی، ادویات وغیرہ میسر نہ تھیں؛ اس لئے ان کے نتائج اچھے نہیں ہوتے تھے۔ سن ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ یہ طریقۂ علاج بند ہو گیا۔ جب جدید آلاتِ جراحی بن گئے اور ڈاکٹروں کو بہرے پن کے متعلق مزید معلومات حاصل ہوئیں تو انہوں نے دوبارہ اس مرض کا علاج ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ اس مرتبہ نتائج بڑے اچھے نکلے۔ اگرچہ ہر قسم کے بہرے پن کا علاج نہ ہو سکا یا ہر تجربہ سو فی صد کامیاب نہ ہوا پھر بھی اس طریقۂ علاج سے بہت سے لوگوں کو فائدہ پہونچا۔

ان دنوں ۷۰ لاکھ امریکیوں میں، ہر دس میں سے ایک کچھ کچھ بہرے پن کا شکار ہے۔ Stapedectomy آپریشن بہرے پن کے لئے ایک مؤثر ہتھیار ثابت ہو رہا ہے۔ مریض کے لئے یہ آپریشن تکلیف دہ نہیں ہوتا۔ میں آپریشن کے دو گھنٹوں کے دوران بالکل ہوش میں تھا۔ ہاں مجھ پر ایک غنودگی سی ضرور طاری تھی، چونکہ آلۂ سماعت کانوں پر موجود نہ تھا اس لئے ساری آوازیں مدھم مدھم سی لگتی تھیں۔ لیکن جب سرجن نے آپریشن مکمل کر لیا تو تمام آوازیں واضح طور پر سنی جانے لگیں۔ آلاتِ جراحی کی آوازیں، ڈاکٹروں کی باتیں اور نرسوں کے آنے جانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی نے ریڈیو کی آواز اونچی کر دی ہو۔

چند ماہ بعد اسی قسم کا دوسرا آپریشن میرے دوسرے کان پر کیا گیا۔ اور اس کا نتیجہ بھی وہی نکلا۔ اس مرتبہ مجھے ایک

تھی حیرت سے پالا پڑا۔ اب میں دونوں کانوں سے بیک وقت سن سکتا تھا۔ جب میرے پہلے کان نے سننا شروع کر دیا تھا تو میں اس قابل ہو گیا تھا کہ آوازیں سن سکوں، مگر یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ آوازیں کس سمت سے آتی ہیں، اب میں اچھی طرح آوازوں کی سمت بتا سکتا تھا۔

اب میں گرد و پیش کے شور و غوغا کا عادی ہو چکا ہوں، اگرچہ بعض دفعہ میں چاہتا ہوں کہ اپنے سرجن سے کہوں کہ میرے کانوں کے اندر لگے ہوئے فولادی تاروں کے ساتھ ایک سوئچ لگا دیا جائے تاکہ میں جب چاہوں آوازیں سن لوں اور جب چاہوں سننا بند کر دوں۔